رسول صلی اللہ علیہ وسلم

میدانِ جنگ میں

سیّد واجد رضوی

پنجاب بک ڈپو۔ لاہور

پہلی بار

جولائی ۱۹۵۸ء

قیمت:-
۵/- روپے

ناشر:- چوہدری افتخار علی

مقامِ اشاعت:- پنجاب بک ڈپو لاہور

مطبع:- انجمن حمایت پریس لاہور

پیش لفظ

گلزار احمد بریگیڈیر عساکر پاکستان

واجد رضوی صاحب نے "رسولؐ میدانِ جنگ میں" لکھ کر اُردو ادبیات کا رُخ ایک نئی جانب موڑ دیا ہے۔ اُردو زبان کو دربار کی حاضری کا منصب آج تک عطا نہیں ہوا۔ اُردو لشکروں اور لشکر گاہوں کی زبان تھی۔ اور کسی حد تک آج بھی ہے۔ مگر اسے اپنے محسنوں سے شکایت ہے۔ کہ وہ اُسے جب بھی صفحۂ قرطاس پر منتقل کرتے ہیں۔ اس سے شکوہ و شکایت کا کام لیتے ہیں۔ شعر و سخن کی خدمت تو اس نے جی بھر کر کر لی۔ اب ضرورت ہے کہ یہ زبان جس کی بنیاد صف بند و صف شکن دلاوروں نے ڈالی تھی۔ اس میں دلاوری و بہادری کے واقعات درج ہوں۔ اُس میں فنِ صف بندی و صف شکنی کے درس دیئے جائیں۔ اسے فنونِ جنگ کے مختلف پہلوؤں کو روشن کرنے کا ذریعہ بنایا جائے۔ اور اس میں وہ سب خوبیاں پیدا کی جائیں۔ جو زندہ قوموں کی زبانوں میں ازل سے پائی گئی ہیں۔

واجد رضوی صاحب مبارکباد کے مستحق ہیں۔ کہ انہوں نے اس جانب اپنے قلم کو موڑا ہے اور ابتداء سے ابتداء کی ہے۔ ہماری تاریخ نے فنِ جنگ کے کمالات لاتعداد میدانوں میں دکھائے ہیں۔ ان کمالات کی ابتداء حضور سرورِ کونین خاتم النبیین محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے خود بنفسِ نفیس کی۔ کوئی نہیں کہہ سکتا۔ کہ اس فن سے مسلمان ناواقف رہے۔ مگر عجب بات یہ ہے کہ آپ یورپ کے عسکری ادب کو چھان ماریں۔ ہنی بال اور سیزر کی جنگوں کے تذکرے، اصُولِ جنگ کے استعمال میں ان کے کمالات کی باریکیاں اور ان کی تزویرات و تدبیرات پر ہزاروں کتابیں مل جائیں گی۔ مگر کسی مسلمان سپہ سالار کا نام تک ان صفحات میں نہیں مل سکے گا۔ انہیں ادبی اور ذہنی تعصب کی بہت سی وجوہات تھیں۔ اب یہ ہمارا کام ہے۔ کہ ہم اس خلاء کو پُر کریں۔

واجد رضوی صاحب نے حضورؐ کو میدانِ جنگ میں دکھایا ہے۔ یہ پہلو اب تک تاریخ کے مختلف اوراق میں بکھرا پڑا تھا۔ انہوں نے اب اسے یکجا کیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ یہ بھی بتایا ہے کہ حضورؐ کے کارنامے عہدِ حاضر کی تحقیقات کی روشنی میں کس بلند پایہ کے تھے۔ آج تک یہ غلط فہمی چلی

آتی تھی۔ کہ اسلام کی فتوحات کی تہہ میں مسلمانوں کا وہ جذبۂ شہادت تھا جس کی مثال دُنیا میں پہلے کہیں نہیں دیکھی گئی تھی۔ بجا۔ مگر محض جذبۂ شہادت جنگوں کی کامیابی کے لیے کافی نہیں ہوتا جس طرح شمشیر وسناں ہاتھ میں لے کر مَیدانِ جنگ کا رُخ کرنا پڑتا ہے۔ اُسی طرح جب مَیدانِ جنگ میں فوجیں پہنچ جاتی ہیں۔ تو انہیں صف آرائی کے لیے مَیدانِ جنگ کے قوانین کا احترام کرنا پڑتا ہے۔ مَیدانِ جنگ کے قوانین نہایت کڑے اور اٹل ہوا کرتے ہیں۔ اُن سے کوتاہی کرنے والوں کو مَیدانِ جنگ تو کجا اس دُنیا پر زندگی جاری رکھنے سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ درست ہے کہ مسلمان تعداد اور تجہیزاتِ جنگ میں اپنے دُشمنوں سے ہمیشہ کمتر ہوا کرتے تھے۔ مگر اصل سپہ سالاری اور تزویراتی اور تدبیراتی کی بلندی تو یہی ہے۔ کہ کمتر تعداد اور کمزور ترہتھیاروں سے فتح حاصل کی جائے۔ مُسلمانوں کے عروج اور ان کی بہترین جنگوں سے کئی صدیاں بعد جرمن جنرل فان مالٹکے کہتا ہے۔ کہ سپہ سالار کی قابلیت اس بات میں ہے۔ کہ وُہ فوجوں کا استعمال اس ڈھنگ سے کرے۔ کہ اپنے سے برتر تعداد کی فوج کو شکست ماننے پر مجبُور کرے۔ حرکتی جنگ کی بنیاد ہی یہ ہے۔ کہ بھاری بھر کم فوجوں کو ناکارہ کر دیا جائے۔ اگر بغور مطالعہ کیا جائے۔ تو اسلامی جنگوں میں یہ اصُول اپنی پوُری آب و تاب سے نظر آئے گا۔ مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ مسلمانوں کی فتوحات ان کے جذب و شوق، آرزُوئے شہادت اور فنِ جنگ کے کمال کا نتیجہ ہیں۔ جب وُہ اس فن کو بھُول گئے۔ تو جذب و شوق بھی کھو بیٹھے۔ اور ہر مَیدان میں پسپا ہوُئے۔

اسلامی فنِ جنگ کی ابتدا حضوُرِ اقدس کی ذاتِ مبارک نے کی۔ ضروری ہے کہ ہم حضوُر کی جنگوں کا بغور مطالعہ کریں۔ یہی نہیں بلکہ دیکھیں کہ جنگ سے متعلق دُوسرے امور کو حضوُرؐ کس قدر سلجھایا کرتے تھے۔ فوجوں کی تیاری، اسلحہ کی فراہمی، اس نوزائیدہ مملکت میں سپاہی کو کیا مقام بخشا گیا تھا۔ بھرتی، لام بندی، انتظاماتِ جنگ، اسیرانِ جنگ سے متعلقہ امور اور ایسے ہی دوسرے ضروری پہلوؤں کو کس طرح انجام دیا جاتا تھا۔

یہاں یہ کہنا ضروری ہے۔ کہ زندہ قومیں ان مباحث میں نہیں پڑتیں کہ جنگ ناگزیر ہے یا نہیں۔ یہ سوال اس وقت پیدا ہوا کرتا ہے۔ جب قومیں انحطاط و تنزل ہو چکی ہیں۔ اور اُن کے افرادِ جنگ کی صعوبتوں سے منہ موڑنے کی فکر میں لگ جاتے ہیں۔ جب تک انسان کی فطرت موجودہ نہج پر ہے اُس وقت تک جنگوں کا وجود اس دنیا میں قائم رہیگا۔ اور وحید رضوی صاحب کے الفاظ میں خون کے دھبے اشکوں سے نہیں خون ہی سے دھوئے جا سکینگے۔ اور "دہشت و بربریت کا انسداد" صرف طاقت اور قوت ہی سے ممکن ہوگا۔ "رسُول مَیدانِ جنگ میں" آپ کے سامنے ہی ہے۔ پڑھیئے اور حضوُر کی زندگی کے اس پہلو اور آپ کی سپہ سالاری کی جزئیات سے واقفیت حاصل کیجیے۔ زندہ قوموں کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ کہ ان کے "قصۂ پارینہ" کو بار بار ان کے سامنے پیش کیا جائے اور مستحقِ مبارک ہیں وہ لوگ جو اس فرض کو انجام دیتے رہتے ہیں۔

تعارف

اکتوبر ۱۹۵۷ء کی ایبٹ آباد کی ایک شام میرے ذہن میں ہمیشہ کے لیے نقش ہو کر رہ گئی ہے۔ آسمان گہرا نیلا تھا۔ اور خزاں زدہ سُرخ چناروں کے سایوں میں پھُول مسکرا رہے تھے۔ وُہ شام جنّت نظیر ہی نہ تھی۔ بلکہ فکر کے لیے بھی سامانِ نشاط فراہم کر رہی تھی۔

اس شام انسانیت کے رہبرِ اعظم کے حضور میں خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے بزمِ علم و فن کے زیرِ اہتمام ایبٹ آباد میں ایک جلسہ منعقد ہوا تھا۔ اس جلسہ میں ایک چھریرے بدن اور بڑی بڑی آنکھوں والے نوجوان مقرر نے "رسُولِؐ میدانِ جنگ میں" کے عنوان سے تقریر کرنا کیا شروع کی کہ شوکتِ الفاظ کا ایک سَیلِ رواں اُمڈ آیا۔ یہ اِک بارشِ انوار تھی جو پژمردہ دلوں کے چمن میں عقیدت و عبودیت کے گُلِ نورستہ کھلا رہی تھی۔ سحر بیان خطیب کے اعجازِ تقریر سے حاضرین ایسے مسحور ہوئے کہ پروازِ وقت کا احساس بھی نہ رہا۔

وہ خوش پوش قانون داں، وُہ شعلہ نوا مقرر ہی اس کتاب کا مصنّف ہے۔ قدرت کی فیاضیوں نے اسے سحر طراز زبان کے ساتھ پروازِ قلم سے بھی نوازا ہے۔ علم اور فنِ حرب اس کی میراث ہیں۔ کیونکہ وُہ دکن کے مشہور مجاہد اور بزرگ حضرت خواجہ سیّد شمس الدین غازیؒ کے خاندان کا چشم و چراغ ہے۔ یہ بزرگ اہلِ قلم بھی تھے۔ اور اہلِ سیف بھی۔ انہی کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے جواں سال واجد رضوی نے جامعہ عثمانیہ سے قانون کی تعلیم اور فوجی تربیت مکمّل کرنے کے بعد مجاہدِ دکن سیّد قاسم رضوی کا دامن سنبھالا۔ اور جلد ہی وُہ اپنی ذہانت، محنت اور خلوص کی بدولت اُن کا دستِ راست بن گیا تقسیمِ ہند کے بعد جب ہندو سامراجیوں نے حیدر آباد کی سرحدوں پر حملے شروع کر دیئے تو ایک سرحدی ضلع کی مجلسِ اتحاد المسلمین کے صدر کی حیثیت سے ضلع کے فوجی دفاع کا کام اس کے سپرد ہوا۔ وہ کئی جانباز رضاکاروں کے ساتھ ستمبر ۱۹۴۸ء تک ہندوستانی فوجوں کے خلاف ڈٹا رہا۔ اور سقوطِ حیدر آباد کے بعد مجلسِ اتحاد المسلمین کا ایک اہم پیغام لے کر خطرات سے کھیلتا ہوا پاکستان پہنچ گیا۔ کچھ عرصہ کراچی میں قیام کیا۔ اور پھر ایبٹ آباد میں وکالت شروع کر دی

شاعری غالبؔ کے لیے ذریعۂ عزّت نہ تھی۔ اسی طرح وکالت ہی واجد کا نشانِ امتیاز نہیں اس کے علاوہ وہ بھی کئی اعلیٰ اصلاحیتوں کا مالک ہے۔ متعدد قانونی کتابوں کے علاوہ "حیاتِ مجاہدِ اعظم قاسم رضوی" اور "دانائے راز" اُس کے فنِ تحریر اور تبحرِ علمی کے دلکش نمونے ہیں۔

(پروفیسر محمدؐ یوسف عبّاسی)

پی۔ایم۔اے۔کالج

فہرس

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

انسانی تہذیب کی بنیاد انسانی خون کے احترام پر رکھی گئی ہے اور انسانی تمدّن کا ارتقا احترام نفس ہی کے اخلاقی اصولوں کا رہینِ منّت ہے۔ دنیا میں جتنے بھی پیغمبرانِ دین آئے اُن سب نے اسی کی تعلیم دی ہے۔ خدا کی ربوبیت اسی پر دلالت کرتی ہے اور فطرت کے ہر آئین سے نہ صرف انسان کی حفاظت بلکہ کائنات کی ہر شے کی پرورش اور ترقی کی بھی ضمانت ہوتی ہے ——— ! ہم دیکھتے ہیں کہ زمین اور آسمانوں کا پالنے والا پیاسی زمین پر پانی برساتا ہے۔ اُس کی مخلوق جب بھوک سے بے تاب ہوتی ہے تو اُس کے لیے غذا فراہم کرتا ہے۔ اور خشک سالی کے آثار جب چھا جاتے ہیں تو آسمانِ رحمت پر کالی گھٹاؤں کو پھیلا دیتا ہے ——— ! تو پھر وہ کہ جو درختوں کی ٹہنیوں کو سبز پتوں اور سُرخ پھولوں کی زیبائش سے محروم نہیں رکھتا، کیا وہ انسان کی ہلاکت کو پسند کر سکتا ہے؟ کیا نوع انسان کی خونریزی اُسے خوش آ سکتی ہے؟۔ اور کیا یہ حیرت کی بات نہیں ہے کہ وہ اشرف المخلوقات کی خونریزی کے لیے اُس کو حکم دیتا ہے جسے کہ وہ کائنات کے لیے رحمت اور انسانیت کا محسنِ اعظم بنا کر بھیجتا ہے؟

اس صورت حال کی وضاحت کے لیے ہمیں دیکھنا ہو گا کہ رسولِ عربیؐ نے میدانِ جنگ کی طرف رُخ کرنے کا جواز کیا ہے، اور موضوع کے دیگر پہلوؤں کو سمجھنے کی خاطر ہمیں معلوم کرنا ہو گا کہ:

۱۔ میدانی جنگ کے اصول کیا ہیں۔

۲ - بحیثیت سپہ سالار آپؐ کا کردار کیا ہے؟ اور فنِ حرب کے اعتبار سے آپؐ کی جنگیں تاریخ کی دوسری جنگوں سے ممتاز کیوں ہیں۔

۳ - قوانینِ جنگ میں آپؐ نے کیا اصلاحات فرمائی ہیں اور آج اُن کی کیا اہمیت ہے

چنانچہ کتاب ہٰذا کے پہلے باب میں جہاد کے اصول اور اسلامی جنگوں کے جواز پر بحث کی گئی ہے۔ دوسرے باب میں رسول اللہؐ کی جنگوں کو فنِ حرب اور تاریخ کے چند اہم میدان ہائے جنگ کے پس منظر میں پیش کیا گیا ہے۔ اور تیسرے میں اُن اصلاحات کی تشریح کی گئی ہے جو آپؐ نے قوانینِ جنگ میں نافذ کی ہیں اور ان اصلاحات کا مقابلہ دیگر مذاہب اور عہدِ جدید کے قوانینِ جنگ سے کیا گیا ہے۔

پہلا باب

رسولؐ عربی کی جنگ کا جواز

خون کے دھبے اشکوں سے نہیں، خون ہی سے دھوئے جا سکتے ہیں،
وحشت و بربریت کا انسداد بے کسی اور کمزوری سے نہیں بلکہ طاقت اور
قوت ہی سے ہو سکتا ہے، توپوں کی گرج کو درماندگی کی چیخوں سے نہیں،
شیرانِ خدا کی گرج ہی سے خاموش کیا جا سکتا ہے، اور جنگ کا
خاتمہ آہوں سے نہیں بلکہ جنگ ہی سے ممکن ہے ——— !

جنگ کا جواز

انسانی خون کی عزت

تاریخ عالم اِس امر کی شاہد ہے کہ انسان ابتداہی سے نہایت باغی اور سرکش واقع ہوا ہے۔ اُس نے بار بار خدائیت کی توہین کی ہے۔ حق تعالیٰ کے جلال و جبروت کی تحقیر اور اُس کی رحمتوں کی تضحیک کی ہے اس نے حقوقِ الٰہی میں دست اندازی کی ہے۔ انسانوں کو خدا کا بیٹا بنایا ہے، اُس کے دامنِ توحید پر حملے کئے ہیں اور صرف آفتاب و مہتاب ہی کو نہیں بلکہ جانوروں اور پرندوں پتھروں اور لکڑیوں، اور خونخوار درندوں اور زہریلے سانپوں کو بھی اس کا شریک بنا دیا ہے۔ اُس نے خدا کے پیغاموں کو رد کیا ہے، پیغمبروں کی نصیحتوں کو ٹھکرایا ہے، اور حق تعالیٰ کے برگزیدہ بندوں کی نہ صرف توہین کی ہے بلکہ انہیں اذیتیں بھی دی ہیں اور بعض اوقات انہیں قتل بھی کر ڈالا ہے —— لیکن خدائے ذوالجلال نے اس سرکشی کے باوجود اس باغی انسان کے خون کی حرمت کو قائم رکھا اور اپنے حقوق کی حفاظت اور احترام کے لیے کبھی ایک قطرۂ خون تک نہیں بہایا! یہ صحیح ہے کہ اُس نے ایسی متمرد قوموں کو مٹا دیا، اور اُن کی تہذیب تمدن کو فنا کر دیا۔ ثمود کو زمین کی زلزلہ انگیز لرزش نے پیوندِ خاک کر دیا، عاد کو ہیبتناک آندھیاں اڑا لے گئیں، اور قوم نوح کو طوفان خیز موجوں نے تہہ آب کر دیا۔ لیکن جس سرزمین پر وہ آباد تھے اُس کے دامن پر خون کا ایک بھی دھبہ نظر نہ

آسکا ——— ! البتہ انسان نے جب حقوق اللہ سے تجاوز کر کے حقوق العباد پر چھاپہ مارنا شروع کیا، خدا کے بندوں کو اُن کے فطری حقوق سے محروم کرنا چاہا، انہیں اپنا غلام بنا لیا، اُن کی زمینیں چھین لیں، اُن کی محنت کا استحصال کیا، اُن کے خون سے اپنی ہوسِ ملک گیری کی تسکین کی، اُن کی ہڈیوں کی بنیاد پر اپنے عیش و نشاط کے محل تعمیر کئے۔ اور مقامِ انسانیت کی تذلیل کی تو خدا نے بھی انسانیت کے عزت و احترام کے لیے خود انسان ہی کو کھڑا کر دیا، اُس کے ہاتھ میں تلوار دی اور حکم دیا کہ ”وَقَاتِلُوهُمْ حَتّٰى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ“

یعنی تم اُن سے برابر جنگ کئے جاؤ یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے ...... !

کون کہہ سکتا ہے کہ اس حکم سے خدا کا منشاء امن و سلام نہ تھا؟ .... لیکن امن و سلامتی ہی کے قیام کے لیے اُسے تلوار کا استعمال کرنا پڑا، خونریزی کو محو کرنے کے لیے خونریز فتنہ کا خون بہانا پڑا، کیونکہ خون کے دھبے اشکوں سے نہیں، خون ہی سے دھوئے جا سکتے ہیں! وحشت و بربریت کا انسداد بے کسی اور کمزوری سے نہیں! طاقت اور قوت ہی سے ہو سکتا ہے، توپوں کی گرج کو درماندگی کی چیخوں سے نہیں بلکہ شیرانِ خدا کی گرج ہی سے خاموش کیا جا سکتا ہے، اور جنگ کا خاتمہ آہوں سے نہیں بلکہ جنگ ہی سے ممکن ہے۔ !

پس منظر

دنیا کی پہلی جنگ ، جن حالات میں رسولِ عربی نے میدانِ جنگ کا رُخ کیا ہے اُن کو سمجھنے کی خاطر آیئے ایک لمحہ کے لیے ہم غور کریں کہ آپ کی بعثت سے پہلے جنگ اور خونریزی کی نوعیت کیا تھی۔

قرآن مجید سے ثابت ہے کہ دنیا کی سب سے پہلی جنگ آدم علیہ السلام کے بیٹوں میں ہوئی تھی اور اس جنگ کی بنیاد بغض و حسد کے جذبات تھے۔ قرآن حکیم فرماتا ہے کہ:۔

اور آدم کے دونوں بیٹوں کا صحیح صحیح قصہ اُن لوگوں کو سُنا دو جب کہ اُن دونوں نے خدا کے لیے قربانی کی۔ لیکن ایک کی مقبول ہوئی۔ اور دوسرے کی نامقبول ہوئی۔ اس پر دوسرے نے حسد سے بھر کر کہا میں تجھ کو قتل کر دوں گا"۔ دوسرے نے جواب دیا کہ یہ حسد ناحق کا ہے اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ خدا تو صرف پرہیزگاروں ہی کی قربانی قبول کرتا ہے اگر تم نے میرے قتل کے لیے ہاتھ بڑھایا تو خیر مجھے قتل کر ڈالو۔ مگر میں اپنا ہاتھ تمہارے قتل کے لیے کبھی نہیں اٹھاؤں گا، کیونکہ میں دنیا کے پالنے والے خدائے برحق سے ڈرتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم ہی پر میرے اور تمہارے دونوں کے گناہوں کا وبال پڑے، اور تم ہی اصحاب النار میں داخل ہو۔ بالآخر اُس کے دل نے اپنے بھائی کے قتل و خون پر آمادہ کر دیا۔ اور اُس نے قتل کر کے اپنے سامنے ناکامیابی کا راستہ کھول دیا۔

پھر خدا نے ایک کوّے کو بھیجا جو زمین کرید تا تھا تاکہ اُس کو اپنے بھائی کے دفن کرنے کا طریقہ بتائے۔ اس کو دیکھ کر اس نے کہا کہ حیف ہے میں تو اس کوّے سے بھی گیا گزرا! وہ تو اپنے ایک ہم جنس کو گاڑنے کے لیے زمین کھود رہا ہے، لیکن میں انسان ہو کر اپنے بھائی کے ساتھ ایسا سلوک کرتا ہوں۔ غرضکہ وہ اپنے دل میں نادم و متاسف ہوا۔ اسی وجہ سے ہم نے بنی اسرائیل پر فرض کر دیا کہ جس شخص نے کسی کو بغیر قصاص کے یا بغیر کسی فساد کے قتل کر دیا تو گویا اُس نے اپنی گردن پر تمام دنیا کا خون لے لیا۔ اور جس نے کسی ایک آدمی کو قتل سے بچایا تو گویا اُس نے تمام دنیا کو زندہ کر دیا"۔

توراۃ سے پتہ چلتا ہے کہ آدمؑ کے یہ دونوں بیٹے قابیل اور ہابیل تھے۔ ہابیل کی قربانی اس کی نیک نیتی کی وجہ سے قبول ہوئی۔ لیکن قابیل کی قربانی اس لیے نامنظور ہوئی کہ اس کا دل نیک نہ تھا۔..... یہ دونوں در اصل "جنگ" اور "صلح" کے مجسّم تھے جنھوں نے جنگ و صلح کا متضاد تصور لوقتِ واحد دنیا کے لیے پیش کیا ہے۔ قابیل نے مارے حسد کے اپنے بھائی کی جان لی اور اس طرح وسوسۂ شیطانی سے مغلوب ہو کر بہمیت کی ایک بدترین مثال قائم کی جو نوعِ انسانی کے لیے شدید ترین مصیبت کی بنیاد ثابت ہوئی۔ اسی لیے آنحضرت صلعم نے فرمایا ہے کہ:

ہر وہ شخص جو قتل کیا جاتا ہے اُس کے خون کا ایک حصّہ آدم کے اُس بیٹے ہی کی گردن پر ہوتا ہے جس نے قتل و خونریزی کی سب سے پہلے بنیاد ڈالی تھی"۔

جنگوں کی ابتداء: انسان خود کام واقع ہوا ہے۔ اس لیے خود کامی ہی درحقیقت جنگ کا سرچشمہ رہی ہے۔ جس کے پیش نظر کبھی "اسباب زندگی" کی فراہمی اور کبھی "افسری و سیادت" کی لذت ہوتی ہے۔

قیاس یہ کہتا ہے کہ ابتدا صرف پیٹ بھرنے، اسباب زندگی جمع کرنے، یا چراگاہوں

میں جانور چرانے یا انتقام کے لیے جنگ کی ضرورت پیش آتی رہی۔ ان جنگوں کے لیے فوجوں کی تنظیم اور سرداروں کے انتخابات کی بھی ضرورت محسوس ہوتی رہی اور صدیوں تک شمشیر زنی کے کھیل میں مشغول رہنے سے خونخواری اور لطفِ سالاری کا ایسا چسکا لگ گیا کہ خونریزی کسی پاکیزہ مقصد یا اہم ضرورت کے لیے نہیں بلکہ مقصود بالذات ہو گئی اور انسانی خون کے احترام کا کوئی تصوّر باقی نہیں رہا ——— آنحضرت صلعم کی بعثت سے پہلے چار بڑے مذاہب دنیا میں رائج تھے اور کم از کم دو ممالک تہذیب و شائستگی کے مرکز سمجھے جاتے تھے۔ ہم یہاں سرسری طور پر دیکھیں گے کہ ان مذاہب میں جنگ کے مقاصد کیا تھے اور ان مہذب ممالک میں لڑائی کی صورت کیا تھی۔

دنیا کے ان چار بڑے مذاہب کے منجملہ ہندومت اور یہودیت میں جنگ کی اجازت ہے۔ اور باقی دو مذاہب بدھ مت اور عیسائیت میں انسانی خون بہانے کی ممانعت کی گئی ہے۔

ہندومت

ویدانت، گیتا، اور منوسمرتی ہندو مذہب کی مقدس کتابیں ہیں ویدانت کا تعلق اُس زمانہ سے ہے جب کہ آریہ نسل کے لوگوں نے وسط ایشیا سے نکل کر ہندوستان پر حملہ کیا اور یہاں کی قدیم قوموں کو مغلوب کر کے اس ملک پر اپنا تسلّط قائم کرنے کی جدوجہد شروع کی۔ گیتا اُس عہد کی یادگار ہے جب کہ ہندوستان میں قدیم آریہ تہذیب پورے عروج پر تھی، اور ہستناپور کے شاہی خاندان کے دو حصّوں یعنی کورو اور پانڈوں میں جنگ ہوئی تھی۔ اس کتاب میں ہندو تصوّف کے متعدد مسائل پر بحث کی گئی ہے لیکن اس کا محور جنگ ہی ہے جس کا مقصد ایک سپاہی میں لڑائی کا شوق پیدا کر کے رزم آرائی کے لیے اُسے آمادہ کرنا ہے۔ منوسمرتی ایسے دور میں مرتب ہوئی ہے جب کہ آریہ قوم کا نظام تمدن ترقی کر چکا تھا، اُس کی باقاعدہ سلطنتیں قائم ہو چکی تھیں اور ایک معین نظامِ حیات کی ہمہ گیر ضرورت لاحق ہوئی تھی۔ اس کتاب میں جنگ کے کم و بیش تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

اِن کتابوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اہلِ جہاں کے سامنے جنگ کا کوئی بلند اخلاقی مقصد نہیں رکھا ہے۔ بلکہ مال و دولت کی لالچ، قوت و اقتدار کی خواہش، شہرت و ناموری کی آرزو اور حکومت و سلطنت کی تمنا کو جنگ کے لیے وجہ تحریک قرار دیا گیا ہے مقاصد جنگ کے متعلق حسب ذیل امور نہایت وضاحت کے ساتھ ان کتابوں میں پائے جاتے ہیں۔

۱۔ مالِ غنیمت، لُوٹ اور غارت گری

(ا) " دیوتاؤں کی امداد سے ہم دولت کا بڑا خزانہ جمع کرلیں اور اس کے کھتے بھرلیں جو بہت کافی ہو اور بچار رکھنے کے قابل ہو"

(رگ وید ۱:۱۷۱:۶:۷)

(ب) "اے اندر! ہم کو خوب دولت اور خوراک جمع کرلینے دے۔ ہم بہادروں کی سی قوت پیدا کرلیں جو مویشی اور گھوڑے حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔"

(رگ وید ۱:۵۳:۱۴، ۵)

(ج) "ہماری مدد کر تاکہ ہم یہ خواہش پوری کریں، دولت حاصل کریں بہادروں کے ذخیرہ کے ساتھ"
(رگ وید ۶:۵:۱۴، ۷)

(د) "اے اندر! ہم کو دولت دے جو دشمن کو جنگ میں اس طرح مغلوب کردے جس طرح آسمان زمین پہ غالب ہوا ہے۔ ہمیں ایسی دولت دے جو ہزاروں کے مال کے لانے کا سبب بنتی ہے، جو زرخیز زمینیں فتح کرتی ہے۔ اور جو دشمن کو شکست دیتی ہے"
(رگ وید ۱۱۲۰۱۶)

(ہ) "اے اندر! جب میدان جنگ گرم ہو تو ہمارے پاس مال و دولت کے جمع کئے ہوئے خزانے لا، ہمارے دشمنوں کو ہلاک کردے، ہمارے حریفوں کے ہتھیار توڑ دے ... ہمیں مال و دولت عطا کر ..... اے بہادر! ہم فتح یاب ہوں، مال غنیمت حاصل کریں۔
(رگ وید ۷:۲۵:۲:۳، ۵، ۶)

(و) " یہ اگنی ... غارت گری کی جنگ میں مال غنیمت لائے۔" (یجروید ۴:۱۴)

(ہ) "دولت کا مالک تو ہی ہے۔ ہم تجھ سے خزانوں کی خواہش کرتے ہیں ۔۔۔۔ ہم کو زبردست درخشاں مال و زر عطا کر۔ لڑائی اور جلال و جبروت کے ہیرو! ہم کو مویشیوں کے تھان کا ایک حصّہ بخش دے۔"

(سام وید ۴ : ۱ : ۴ : ۵ ، ۶)

(ح) "ہمارے یہ دشمن بے ہاتھ کے ہو جائیں ہم ان کے سست بازوؤں کو بیکار کر دیں! اور اس طرح اے اندر! ہم اُن کی ساری دولت آپس میں بانٹ لیں"

(رگ وید ۶ : ۶۶ : ۳)

۲ - شہرت و ناموری کی خواہش۔

(ا) "جب اچھے نقشے کے ساتھ بہادر لوگ فوج کو آگے بڑھاتے ہیں تو وہ باقاعدہ جنگ میں فتح حاصل کرتے ہیں اور شہرت و ناموری کی تلاش میں بڑھتے ہیں اور وہاں تے چلے جاتے ہیں"

(رگ وید ۱ : ۱۷۴ : ۱۰)

(ب) "اے اندر! ۔۔۔۔ ہمیں عظیم الشان شہرت اور مال و دولت عطا کر ۔۔۔۔"

(رگ وید ۷ : ۲۵ : ۳۰۲)

۳ - قوت و اقتدار کی ہوس۔

(ا) "پس اے اندر! ہم کو بڑھنے والی قوت عطا کر، ہم کو وہ قہر اور طاقت عطا کر جو قوموں کو مغلوب کرے، ہمارے دولت مند سرداروں کو برقرار رکھ، ہمارے راجاؤں کی حفاظت کر۔"

(رگ وید ۱ : ۵۴ : ۱۱)

(ب) "اے اندر! تیری مدد سے ہم اپنے دشمنوں کو جو اپنے تئیں طاقتور سمجھتے ہیں زیر کریں۔ تو ہمارا محافظ بن، ہمیں بڑھا، ہمیں قوی بنا۔"

(رگ وید ۱ : ۱۷۹ : ۵)

(ج) "اے اندر! ہمیں بہادرانہ سطوت عطا کر ۔۔۔۔ تیری مدد سے ہم جنگ میں اپنے دشمنوں کو مغلوب کریں ۔۔۔۔"

(رگ وید ۶ : ۱۱ : ۸ - ۱۰)

(د) "تو کھن کھاتے دخت کو ریزہ ریزہ کر دے، داسوں کی قوت کا قلع قمع

کردے ..... "
(رگ وید ۸ : ۸۴ : ۶)

(ھ) اے اگنی! ہماری مزاحمت کرنے والی جماعتوں کو مغلوب کر ہمارے دشمنوں کو بھگا دے۔ اے اجیت دیوتاؤں کو نہ ماننے والے حریفوں کو قتل کر اور اپنے پجاری کو عظمت و شوکت نصیب کر"
(یجر وید ۱۶ : ۳۷)

(و) " روئے زمین کے جو حکمران ایک دوسرے کو نیچا دکھانے یا قتل کرنے کی خواہش سے اپنی تمام قوت کے ساتھ جنگ کرتے ہیں اور کبھی منہ نہیں موڑتے وہ مرنے کے بعد سیدھے بہشت کی طرف جاتے ہیں" (منو ۷ : ۸۹)

(ز) " پس ایسے راجہ کو اپنی متحدہ فوج کے ساتھ تمام مخلوقات کو اپنا تابع فرمان بنانے کی کوشش کرنی چاہیئے"۔
(منو ۷ : ۱۰۳)

۴ - ہوسِ مُلک گیری

(ا) "تیر کمان کی مدد سے ہم گھمسان کی لڑائیوں میں فتحمند ہوں۔ تیر کمان دشمن کو غمگین کرتی ہے۔ اس سے مسلح ہو کر ہم تمام ممالک فتح کریں"
(رگ وید ۶ : ۷۵ : ۱-۲)

(ب) " ...... اگر تو مر گیا تو سورگ کو جائے گا۔ اور فتح یاب ہوا تو دنیا کے راج کو بھوگے گا۔ اس لیے جنگ کرنے کا مستقل ارادہ کر کے اُٹھ"
(گیتا ۲ : ۳۷)

(ج) "سلطنت کی توسیع کے لیئے کامیابی کے ان چار ذرائع میں سے عقلمند لوگ صلح و رضا اور جنگی طاقت کو زیادہ پسند کرتے ہیں" (منو ۷ : ۱۰۹)

(د) "اس طرح جب راجہ دھرم کے مقرر کئے ہوئے تمام فرائض ادا کر لے تو اس کو اُن علاقوں پر قبضہ کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے جو ابھی تک اس کے قبضہ میں نہ آئے ہوں اور اپنے مقبوضہ ممالک کی خوب حفاظت کرنی چاہیے"
(منو ۹ : ۲۵۱)

(ھ) " ...... راجہ کا خالص فرض یہ ہے کہ وہ ممالک فتح کرے اور جنگ

سے کبھی نہ ٹلے" (اتھروید ۱۰ : ۱۱۹)

۵۔ انتقام اور وحشت و بربریت۔

(ا) "ہر بدگو کو قتل کر دے اور جو کوئی ہم کو خفیہ طریقوں سے تکلیف پہنچائے اسے برباد کر . . . ." (رگ وید ۱: ۲۹ : ۷)

(ب) " . . . . وہ (دشمن) اپنی قوت کے زعم باطل میں پھولے ہوتے ہیں۔ ان کو قتل کر . . . ." (رگ وید ۲ : ۳۰ : ۱۰)

(ج) "اے منیو! (غضب کا دیوتا) ہم سے لڑنے والوں پر غالب آ، توڑے جا قتل کئے جا، دشمنوں کو کچلے جا۔" (رگ وید ۱۰ : ۸۴ : ۲)

(د) "اے اگنی! تو یاتودھانوں (دشمنوں) کو یہاں باندھ کر لا اور پھر اندر اپنی کڑاک سے ان کے سروں کو پاش پاش کر دے۔" (اتھروید ۱ : ۷ : ۷)

(ھ) "اے منیو! طاقتور سے زیادہ طاقتور ہو کر ادھر آ اور اپنے غضب سے ہمارے تمام دشمنوں کو ہلاک کر دے . . . ." (اتھروید ۴ : ۳۲ : ۱)

(و) "اے آگ کے دیوتا! تو یاتودھانوں (دشمنوں) کی کھال میں گھس جا، تیرا تباہ کن تیر (یعنی شعلہ) ان کو بھسم کر ڈالے۔ اسے جات وید! ان کے جوڑوں کو کچل ڈال۔" (اتھروید ۸ : ۳ : ۴)

(ز) "یاتودھانوں کے دلوں کو تیر سے چھید ڈال اور ان کے بازوؤں کو جو تجھ پر حملہ کرنے کے لیے اٹھیں توڑ دے۔ ان شیطانوں کے سامنے بھڑک کہ اسے اگنی! انہیں مار گرا۔ مردار خوار چتکبرے گدھ انہیں کھائیں ان پلیدوں کو آدمیوں میں سے آدم خور کی طرح تاک کر ان کے تینوں اوپر کے اعضا توڑ ڈال، اپنے شعلوں سے ان کی پسلیوں کو کچل دے۔ اے اگنی! ان کے نیچے کے تین ٹکڑے کر دے۔"

(اتھروید ۸ : ۳ : ۶-۷-۱۰)

(ح) "پس اے دیوی گائے! . . . . اپنی سو گرہوں والی بان سے اجو اتر سے

ے پھل کی طرح تیز ہے، ہلاک کر، اس کے سر کو کندھوں سے الگ کر دے اس کے سر کے بال نوچ ڈال، اس کے بدن کی کھال کھینچ لے، اس کے پٹھے کھینچ لے، اس کے ڈھانچے پر سے گوشت کی بوٹی بوٹی اتار لے، اس کی ہڈیوں کو کچل دے، اس کے سر سے بھیجا نکال لے اور اس کے سب اعضا اور جوڑوں کو الگ کر دے۔ (۱۲:۵:۶۵ ۔۔۔۔۔۔۱۷)

۶۔ قتلِ انسان،

یہ کوئی جرم نہیں ہے۔ کیونکہ عقیدہ تناسخ کی رو سے انسان ایک دفعہ مر کر پھر دوسرے جنم میں آجاتا ہے۔ اگر کوئی شخص کسی کو قتل کرتا ہے تو وہ صرف روح پر سے جسم کا لباس اتار دیتا ہے، اور یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ نیز جب انسان کو ایک دن مرنا ہی ہے تو اسے قتل کر دینے میں کیا قباحت ہے۔

چنانچہ کرشن جی کہتے ہیں کہ:

"جسم کی مالک آتما غیر فانی اور ناقابل ادراک ہے۔ اور اس کو حاصل ہونے والے اجسام فانی ہیں۔ اس لیے اے ارجن! تو جنگ کر۔ جو شخص سمجھتا ہے کہ آتما مارتی ہے یا ماری جاتی ہے، اس کو سچا گیان حاصل نہیں ہے۔ کیونکہ یہ آتما نہ تو مارتی ہے اور نہ ماری جاتی ہے۔ یہ آتما کبھی پیدا ہوتی ہے اور نہ مرتی ہے ۔۔۔۔۔۔ اس لیے جسم کے مارے جانے سے یہ نہیں ماری جاتی ۔۔۔۔" (گیتا ۲: ۱۸ - ۱۲)

اور "سب کے جسموں میں رہنے والی جسم کی مالک آتما کو کبھی کوئی نہیں مار سکتا۔ اس لیے اے بھارت! کسی جاندار کے لیے افسوس کرنا تجھے مناسب نہیں" (گیتا ۲: ۳۰)

یہودی مذہب

یہودیوں کی متعدد مذہبی کتابیں موجود ہیں۔ لیکن بجز تورات کے کسی کتاب پر تمام فرقے متفق نہیں ہیں۔ اسی کتاب

کی روشنی میں ہمیں دیکھنا ہوگا کہ یہودیوں کے نزدیک مقاصد جنگ کیا ہیں۔ اور ان جنگوں کی نوعیت کیا ہے۔ ساتھ ہی اس امر کو بھی ملحوظ رکھنا ہوگا کہ جو توراۃ آج موجود ہے وہ درحقیقت وہ کتاب نہیں ہے جو کہ حضرت موسیٰ پر نازل ہوئی تھی، بلکہ وہ کتاب ہے جسے عہد عتیق (old testament) کہا جاتا ہے۔

توراۃ میں جا بجا جنگ کا حکم دیا گیا ہے لیکن سوائے حصول مال غنیمت اور ملک گیری کے کسی اور مقصدِ جنگ کا ذکر اس کتاب میں موجود نہیں ہے۔ مال غنیمت کے متعلق کہا گیا کہ:۔ "۔۔۔۔۔ اور ہم نے ان کو یعنی ان کے مردوں اور عورتوں اور لڑکیوں کو ہر ایک شہر میں جیسوں کے بادشاہ سیحوں کی طرح حرم کیا، لیکن سارے مویشی اور شہروں اور مال اسباب کو ہم نے اپنے واسطے لوٹ لیا" (کتاب استثنا ۳:۷)

اور "۔۔۔۔۔۔ ہم نے کسی کو باقی نہیں چھوڑا، سوائے چار پایوں کے جنہیں ہم نے غنیمت جان کر پکڑ لیا اور اس مال کے جو ہم نے شہروں میں سے لوٹا" (کتاب استثنا ۲: ۳۵)

ملک گیری کے متعلق کہا گیا کہ:۔

"۔۔۔۔۔۔ جب تم یردن سے پار ہو کر کنعان میں داخل ہو تو تم ان سب کو جو اس زمین کے باشندے ہیں، اپنے سامنے سے بھگا دو ان کی مورتیں فنا کر دو۔۔۔۔۔ ان کے سب اونچے مکانوں کو ڈھا دو اور ان کو جو اس زمین کے بسنے والے ہیں خارج کر دو اور وہاں آپ بسو کیونکہ میں نے وہ سرزمین تم کو دی ہے کہ اس کے مالک بنو"

(کتاب اعداد ۲۳ : ۵۱-۵۲)

اور "۔۔۔۔ دیکھ میں نے حسبون کے بادشاہ اموری سیحون کو اس کی سرزمین کے ساتھ تیرے ہاتھ میں دیا ہے۔ لہذا اس کی میراث لینا شروع کر اور جنگ میں اس کا مقابلہ کر" (کتاب استثنا ۲: ۲۴)

اور "۔۔۔۔ چنانچہ خداوند ہمارے خدا نے بسن کے بادشاہ عوج کو بھی اس

کی ساری قوم سمیت ہمارے قابو میں کر دیا، اور ہم نے انہیں یہاں تک مارا کہ ان میں سے کوئی باقی نہیں رہا۔ اور ہم نے اُسی وقت اُس کے سب شہر لے لیے ...!
(کتاب استثنا ۲:۳—۶)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جنگ اور خونریزی کے ذریعے ملک گیری اور تلوار کے زور سے لُوٹ اور غارتگری توراۃ کی نظر میں نہ صرف جائز ہے بلکہ ان اغراض کے لیے خون آشامی اور تباہ کاری کی یہ کتاب ترغیب اور دعوت بھی دیتی ہے۔

بُودھ مت

یہ یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ گوتم بدھ کی تعلیم کیا تھی، کیونکہ اس بارے میں کوئی کتاب اُن کی زندگی میں نہیں لکھی گئی۔ اور نہ اُن کی وفات کے بعد ایک سو سال کے عرصہ میں کوئی بات ضبط تحریر میں لائی گئی۔ پہلی مرتبہ ویسالی میں ایک کانفرنس نے بودھ مت کے عقائد کو مرتب کرنے کی کوشش کی۔ مگر بعض بودھی علماء کا خیال ہے کہ اس کانفرنس نے مذہب کے بنیادی اصول ہی بدل دیئے۔ اس کے بعد چار سو سال تک مذہبی احکام کی ترتیب کا سلسلہ جاری رہا اور کنشک کے زمانہ میں اس قدر تحریف کی گئی کہ عقائد میں بنیادی تغیر نمودار ہو گیا ... بہرحال جو کتابیں دستیاب ہو سکتی ہیں اُن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بودھ مت نے ہر ذی روح شے کو معصوم قرار دیا ہے۔ چنانچہ بودھ کے بنیادی دس احکام میں پہلا حکم یہ ہے کہ

"کسی جاندار کو ہلاک نہ کرو"

بودھ نے میدان جنگ میں تماشائی کی حیثیت سے جانے والے کو بھی گنہگار قرار دیا ہے .... دراصل بودھ کی تعلیمات کی بنیاد "نفس کشی" اور "ترکِ دنیا" ہے۔ قنوطیت ان کی فکر سے عیاں ہے۔ وہ زندگی کے بعض تاریک پہلو ہی پر اپنی نظر کو مرکوز رکھتے ہیں۔ انہوں نے انسان کے مقصد حیات کو متعین کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی، بلکہ اپنی ساری توانائیاں اس امر پر غور کرنے میں صرف کر دیں کہ انسانی زندگی میں تغیر کیوں آتا ہے، تندرستی کے ساتھ بیماری خوشی کے ساتھ رنج، راحت کے ساتھ مصیبت، اور پیدائش کے ساتھ موت کو کیوں وابستہ کر دیا گیا ہے، اور اس چکر سے نجات

کی صورت کیا ہے . . . . . ؟ بالآخر وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ زندگی مصیبت ہے اور خواہش اس مصیبت کا سبب ہے۔ اس لیے "نروان" یا نجات کا راز فنا میں مضمر ہے جس کی خاطر خواہش، احساس اور شعور کو پوری طرح مٹا دینا ضروری ہے . . . . اس تعلیم سے واضح ہے۔ کہ بودھ زندگی کے مسائل کا مردانہ وار مقابلہ نہیں کرنا چاہتے، کشمکش اور انقلاب سے نہیں گزرنا چاہتے اور انسانی زندگی کے لیے کوئی اعلیٰ نصب العین مقرر کر کے اس کی خاطر کاوش اور جدّ وجہد کو اپنا شعار نہیں بنانا چاہتے۔ دنیا میں خیر و شر ازل سے موجود ہے۔ ان کی باہمی کشمکش کا سلسلہ ہمیشہ سے جاری ہے۔ خدا کے برگزیدہ نبیوں اور رسولوں نے ہمیشہ تخریبی عناصر کی سرکوبی کی تعلیم دی ہے۔ کیونکہ باطل بار بار اپنا سر اٹھاتا ہے، طاغوتی قوتیں پے درپے ابھرتی رہتی ہیں اور حق کے تحفظ کے لیے بار بار خون بہانے کی ضرورت لاحق ہوتی ہے لیکن گوتم بدھ نے انسانیت کے اس اہم ترین فرض کی طرف سے اپنی آنکھیں بند کر لیں، وہ وہ اپنے تصور میں غلو کر گئے اور جنگ و خونریزی کو ہر صورت میں وحشت و بربریت کے مترادف سمجھنے لگے۔ انہوں نے کسی جگہ حکومت کا مقابلہ کرنے اور سوسائٹی سے تخریبی عناصر کے ازالہ کی تعلیم نہیں دی۔ اُن کے نزدیک حکومت کی بہر حال اطاعت کرنی چاہیے اور ہر حاکم کے حکم کی تعمیل کو اپنا فرض سمجھنا چاہیے خواہ وہ جابر اور ظالم ہی کیوں نہ ہو. . . . یہی سبب ہے کہ "اہنسا" بودھ مت کی تعلیمات کی روح قرار دی گئی اور جنگ و جہاد کا کوئی تعمیری تصور بھی فروغ نہیں پا سکا۔

لیکن یہ تعلیم اس دنیا میں جہاں خیر و شر کا لامتناہی تصادم موجود ہے کسی طرح قابلِ عمل نہیں ہو سکتی تھی، اسی وجہ سے اس مذہب کے پیرؤں کو بالآخر بھکشو اور گرہستی میں فرق کرنا پڑا اور انہوں نے ایک قلیل جماعت کے لیے نروان کو مخصوص کر کے باقی تمام دنیا کو گرہست دھرم اختیار کرنے کے لیے چھوڑ دیا جس میں سیاست بھی ہے، تعزیر بھی ہے اور جنگ بھی اپنی تمام ہولناکیوں کے ساتھ موجود ہے!

مسیحیت

حضرت عیسیٰ کی اصلی تعلیم کسی قابلِ اعتماد ذریعے سے ہم تک نہیں پہنچی ہے۔ اس لیے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انسانی زندگی اور جنگ و جدال

کے بارے میں انھوں نے دراصل کیا احکام دیئے تھے۔ ان حالات میں آج کل کی مسیحی دنیا کے اعتقادات ہی کے مدنظر ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ مسیحیت کا اس خصوص میں کیا نقطۂ نظر ہے۔

انجیل نے "آسمانی بادشاہت" کو انسانی زندگی کا نصب العین قرار دیا ہے لیکن یہ بادشاہت زمین کی بادشاہت سے بالکل مختلف اور متضاد ہے۔ اس کے حصول کے لیے نہ صرف دنیوی حکومت اور مادّی ساز و سامان سے کلّی اجتناب ضروری ہے بلکہ نفس کشی اور ترکِ لذائذ و ترکِ تعلقات بھی لازمی ہے —— درحقیقت مسیحیت نے سنیاس، رہبانیت اور تیاگ کا درس دیا ہے۔ محبت اس کی تعلیم کی اساس ہے لیکن محبت کا جو تصور اس نے پیش کیا ہے وہ ناقابلِ عمل اور انسانی طبیعت کے بالکل خلاف ہے۔ اس تصور کے تحت خدا کی ذات کے علاوہ اس کے ہر بندہ سے محبت ضروری ہے۔ خواہ وہ مفسد، شر انگیز اور ظالم ہی کیوں نہ ہو۔ ظلم و استبداد کے استیصال کے لیے قوت اور جبر کا استعمال قطعاً ممنوع ہے —— دشمن سے محبت کرنا، کوئی ایک گال پر طمانچہ مارے تو دوسرا بھی اس کی طرف پھیر دینا، کوئی کرتا چھین لے تو چوغہ بھی اس کے حوالہ کر دینا، کوئی ایک کوس بیگار میں لے جائے تو اس کے ساتھ دو کوس چلا جانا، اور آسمانی بادشاہت کے لیے مال و دولت اور آرام و آسائش کو ترک کر دینا مسیحی تعلیم کے ضروری اجزا ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ جنگ سے احتراز کا حکم خود کوئی مستقل قانون نہیں ہے بلکہ رہبانیت و ترکِ دنیا کی تعلیم کا ایک لازمی نتیجہ ہے۔

لیکن جنگ سے اجتناب کے اس حکم کے نتائج پر ہم غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ مسیحیت کا یہ قانون اخلاقِ فطرت کے بالکل مغائر ہے۔ اس کا نفاذ کسی ایسی دنیا میں تو ہو سکتا ہے جہاں بدی اور شر کا وجود نہ ہو، انسانوں کی آبادی معصوم فرشتوں کی بہشت زار بن گئی ہو، اور شیطان کے لیے اس دنیا کے دروازے بند کر دیئے گئے ہوں ۔۔۔ لیکن ہماری اس مادّی دنیا میں جہاں نیکی کے ساتھ بدی بھی موجود ہے اور شیطان اپنے تمام حربوں کے ساتھ آزاد ہے۔ نیکی کے تحفظ کے لیے جبر اور قوت کا استعمال نہ کرنا شر

کی ہمت افزائی کے مترادف ہے۔

حضرت عیسیٰ کی بعثت کے وقت اُن کی قوم غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی تھی۔ اس غلامی کا سلسلہ تقریباً آٹھ سو برس سے جاری تھا جس کی وجہ سے قوم کی اخلاقی حالت بہت بگڑ چکی تھی، اُن میں طرح طرح کی برائیاں پیدا ہو گئی تھیں، اور وہ کلمۂ حق سننے کے لیے بھی آمادہ نہیں تھی۔ ان حالات میں حضرت عیسیٰ کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ اپنی دعوت کے آغاز ہی میں اعلان جنگ کر دیتے اور اپنی حکومت قائم کر لیتے —— چنانچہ انہوں نے سب سے پہلے قوم کی اخلاقی حالت کو درست کرنے کی مہم شروع کی اور اس غرض کے لیے ہر وہ تدبیر اختیار کی جس کی بدولت حکومتِ وقت سے کسی قسم کا کوئی تصادم نہ ہو سکے۔ لیکن انہیں اس اخلاقی تربیت کے لیے صرف ڈھائی تین سال کی مدت نصیب ہوئی جس میں قوم کے کردار کو مستحکم کر کے اُسے جہاد فی سبیل اللہ کے لیے تیار کرنا ممکن نہیں تھا۔

لیکن ایک اور زاویۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو یہ حقیقت آشکار ہو جاتی ہے کہ مسیحیت خود کوئی مستقل مذہب نہیں ہے بلکہ حضرت موسیٰ کی شریعت کی تکمیل و اصلاح اس کا مقصد ہے۔ حضرت عیسیٰ نے فرمایا تھا کہ

"زمین و آسمان ٹل سکتے ہیں مگر توراۃ کا ایک شوشہ اور ایک نقطہ بھی ٹل نہیں سکتا۔"

اور "میں توراۃ کو منسوخ کرنے نہیں بلکہ مکمل کرنے آیا ہوں۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مقصد یا طریقۂ جنگ کے بارے میں مسیحیت نے کوئی ہدایت اپنے پیروؤں کو نہیں دی بلکہ جو احکام توراۃ نے دیئے ہیں وہی علیٰ حالہٖ قائم ہیں اور اُن میں کسی ردّ و بدل کا دعویٰ حضرت عیسیٰ کی تعلیم کے منافی ہے. . . . چنانچہ قسطنطین اعظم نے جب اس مذہب کو قبول کیا اور مسیحیت ایک مملکت کا مذہب بن گئی تو اربابِ بست و کشاد کو حرب و ضرب سے متعلق کوئی مخصوص روشنی نظر نہ آسکی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسیحی شمشیر زنوں کے سامنے کوئی اخلاقی حد قائم نہ رہ سکی، مسیحیت تلوار کے زور سے پھیلتی گئی، انسانی خون سے خدا کی زمین رنگین ہو گئی، اور شر انگیزی و فتنہ پردازی خونریزی

غارت گری ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آئینِ حیات بن گئی ۔

روم و ایران

سرورِ کائنات کی بعثت سے پہلے روم و ایران دنیا کے مہذب و متمدن ممالک سمجھے جاتے تھے۔ لیکن ان کے سامنے بھی جنگ کا کوئی اخلاقی نصب العین موجود نہیں تھا۔ ان دونوں ممالک کے درمیان سیاسی و مذہبی اختلافات تھے۔ ایران کا مذہب مجوسی اور روم کا مسیحی تھا۔ اور لڑائی میں جس فریق کو فتح ہوتی وہ دوسرے فریق کے مذہب ہی کو سب سے زیادہ تختۂ مشقِ ستم بناتا تھا۔ اسیرانِ جنگ کو قتل کیا جاتا یا انہیں غلام بنا لیا جاتا تھا۔ اور لوٹ و غارت گری کے لیے فاتح ملک کے عام جنگجو باشندے مفتوحین پر درندوں کی طرح ٹوٹ پڑتے تھے۔

جنگ میں بدعہدی اور دھوکہ دہی جائز سمجھی جاتی تھی اور مقاتلین و غیر مقاتلین کا امتیاز بالکل مفقود تھا۔ روم کی نہ صرف ایران سے دشمنی تھی بلکہ افریقہ کے ونڈالوں اور یورپ کے گاتھوں سے بھی سخت عداوت تھی۔ دراصل رومی حکمران کسی غیر رومی سلطنت کے قانونی وجود ہی کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔ اسی طرح مملکت ایران بھی رومی سلطنت کو تباہ کرنا چاہتی تھی اور ہر غیر ایرانی قوم کو وحشی اور باغی قرار دے کر اُسے کچل دینا اپنا فرض سمجھتی تھی۔ اسی سبب سے یہ دونوں متمدن ممالک لڑائی میں انتہائی وحشیانہ طریقے استعمال کرتے تھے...... فصلوں کو تباہ کرنا، باغوں کو تہس نہس اور عمارتوں کو مسمار کرنا، بستیوں کو لوٹنا اور نذرِ آتش کر دینا، اُن کی لڑائیوں کا ایک ضروری جزو تھا اور عورتوں، بچوں، بوڑھوں، زخمیوں، بیماروں اور مذہبی پیشواؤں کو بلا امتیاز تہِ تیغ کرنا یا غلام بنا لینا اُن کے ہاں بالکل جائز سمجھا جاتا تھا۔

عرب

لیکن جنگ کی اس دیوی کو عرب کے ریگستان بہت پسند آئے جہاں جلتی ہوئی ہواؤں نے اس کی پرورش کی، جہاں وہ جوان ہوئی اور تاریخ کے صفحات پر اپنے خونین پیکر کا وحشت ناک عکس چھوڑ گئی ——— ! تاریخ بتاتی ہے کہ عرب کی تمام جنگیں لوٹ و غارتگری کے لیے ہوتی تھیں۔ اور جن کا سبب انتقام یا تفاخر ہوتا تھا اُن میں بھی غارت گری کی جھلکیاں صاف نظر آتی تھیں اور بغض و عداوت

کی آگ اُن کے وحشیانہ افعال کو ہلاکت آفرین اور قیامت خیز بنا دیتی تھی۔ اگرچہ کہ دنیا کی ہر زبان میں "جنگ" کے لیے جو الفاظ استعمال کئے گئے ہیں ان سے مصیبت اور تباہی کا تاثر پیدا ہوتا ہے، لیکن عرب کے دورِ جاہلیت میں جو الفاظ اس غرض کے لیے استعمال کئے جاتے تھے اُن سے انتہائی وحشیانہ اور مہیب طریقۂ جنگ کا اظہار ہوتا ہے۔ مثلاً "حرب" کے معنی سخت غصہ میں آنے کے ہیں۔ حَرَب کسی کا مال لوٹ لینے کو کہتے ہیں۔ بعض اوقات لڑائی کو آگ سے تشبیہ دی جاتی تھی اور جنگ کو "ذوع" کہتے تھے جس کے معنی خوف کے ہیں۔ اسی طرح لڑائی کے دن کو "یوم کریہہ" (مصیبت کا دن) "هياج" (برانگیختگی) اور "مخضبة" (غصہ و ناراضی) بھی کہا جاتا تھا۔ نیز اس کو چکی، چکر اور اونٹ کے سینے سے تعبیر کیا جاتا تھا —— ان الفاظ سے عرب کی جنگوں کی بہیمیت نمایاں طور پر نظر کے سامنے آجاتی ہے۔

دراصل عربوں کے لیے جنگ اور خونریزی بہت مرغوب چیز تھی۔ ملک کے پست اقتصادی حالات کے تحت لوٹ اور غارت گری اکثریت کا پیشہ بنی ہوئی تھی۔ اور یہ پیشہ بالعموم باعزت اور بہادر افراد کے شایانِ شان سمجھا جاتا تھا۔ کہا جاتا تھا۔ کہ میدان جنگ میں زخمی ہو کر مرنے کی صورت میں روح زخم کے راستہ سے نکل جاتی ہے۔ لیکن جو شخص کسی بیماری کے باعث بستر مرگ پر جان دیتا ہے اس کی رُوح ناک کے ذریعے نکل کر پرواز کر جاتی ہے...... اور ناک کے راستے روح کا نکلنا سخت بے عزتی کی بات سمجھی جاتی تھی!

عرب کی جنگوں کے حسب ذیل محرکات تھے:

۱۔ مال غنیمت کا شوق۔ جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے عربوں کی بسر اوقات ہی بالعموم غارتگری پر تھی۔

۲۔ تفاخر:۔ یہ جذبہ دراصل عربوں کی ایک اہم خصوصیت ہے۔ اپنی طاقت کو منوانے اور اپنی عظمت کو ثابت کرنے کی خاطر وہ ہر قسم کا خطرہ مول لینے کے لیے آمادہ رہتے تھے۔ عہد جاہلیت میں جتنی بھی طویل اور ہولناک لڑائیاں ہوئی

ہیں اُن میں سے اکثر کا سبب یہی جذبۂ تفاخر تھا۔

۲۔ انتقام۔ عربوں کا عقیدہ تھا کہ ہر مقتول کی روح پرندہ بن کر اُڑ جاتی ہے اور اگر قتل کا بدلہ نہ لیا جائے تو وہ پریشان ہو کر پکارتی پھرتی ہے۔ بعض لوگ سمجھتے تھے کہ مقتول صرف ایسی ہی صورت میں زندہ رہتا ہے جب کہ اس کے خون کا انتقام لیا جائے اور بعضوں کا خیال یہ ہے کہ جس مقتول کا بدلہ نہیں لیا جاتا اُس کی قبر میں اندھیرا رہتا ہے ——— اسی لیے انتقام سے کوتاہی کو سخت توہین سمجھا جاتا تھا!

عربوں کا طریقۂ جنگ بھی سخت انسانیت سوز ہوتا تھا۔ عورتوں کو بے پردہ کرنا، دشمن کی نعشوں کو گھسیٹنا، دشمن کے کان اور ناک کاٹ ڈالنا، اور انہیں آگ میں زندہ جلا دینا اُن کی جنگوں میں معمولی باتیں سمجھی جاتی تھیں۔

غرضکہ آنحضرت صلعم کی بعثت سے قبل ہمیں زندگی کی ایک بحرانی کیفیت نظر آتی ہے، انسانی عظمت مفلوج ہو چکی ہے، امنِ عالم خون کی چادروں میں چھپ گیا ہے، اور جنگ و جدال اور لوٹ و غارت گری کے دھکتا ہوئے سائے شعورِ انسانی کے طول و عرض پہ پھیل گئے ہیں ———!

جنگ کا اسلامی تصوّر

انسانی خون کی حرمت

لیکن حسرت ناک نامرادیوں کے ان پردوں کو چاک کرتے ہوئے قدرت کے چمکیلے ہاتھ درد و کرب میں ڈوبی ہوئی انسانیت کی مدد کے لیے اُبھرتے ہیں اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا کو یہ پیغام دیتے ہیں کہ :-

لَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰہُ اِلَّا بِالْحَقِّ

یعنی مت مارو کسی جان کو جو اللہ نے منع کر دی ہے بغیر کسی حق کے اور

اَوَّلُ مَا یُحَاسَبُ بِہٖ الْعَبْدُ الصَّلٰوۃُ وَاَوَّلُ مَا یُقْضٰی بَیْنَ النَّاسِ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ فِی الدِّمَاءِ۔

یعنی قیامت کے دن بندے سے سب سے پہلے نماز کا حساب لیا جائے گا۔ اور پہلی چیز جس کا فیصلہ لوگوں کے درمیان کیا جائے گا وہ خون کے دعوے ہیں۔

اور وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنَ

ہم نے جن و انس کو صرف اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے نہ کہ بغض اور لوٹ مار قتل و غارت اور شر و فساد کے لیے۔

اور لَا تَبَاغَضُوْا وَلَا تَحَاسَدُوْا وَلَا تَدَابَرُوْا،

یعنی ایک دوسرے سے دل میں عداوت اور کینہ نہ رکھو۔ باہم حسد نہ کرو اور نہ آپس میں ایک دوسرے کی جگہ پر اُسے پیچھے ہٹا کر قبضہ کرو!

اس پیغام نے انسانی عظمت کا ایک پاکیزہ تصوّر پیش کیا اور دفعتاً لڑائی کے حلق کی شہ رگ کاٹ دی ـــــــ سرورِ کائنات ایک عرصہ تک یہ پیغام اس دنیا کو

دیتے رہے۔ اس کے لیے فاران کی چوٹیوں پر آپؐ کی آواز بلند ہوئی، مکہ کے بازاروں میں آپ کو عقوبتیں دی گئیں اور طائف کے سبزہ زار آپؐ کے خون کے چھینٹوں سے رنگین ہو گئے۔ . . . . . لیکن آپؐ کے جوش و خروش میں کوئی فرق نہیں آیا، آپؐ کا یقینِ محکم کبھی متزلزل نہیں ہوا کیونکہ آپؐ کو حکم دیا گیا تھا کہ

فَلَا تَهِنُوا وَتَدْعُوا إِلَى السَّلْمِ

یعنی کمزور و سست نہ ہو جاؤ اور دعوتِ صلح برابر دیتے رہو ——— !

لیکن دنیا ہمیشہ قوت کے آگے سرِ تسلیم خم کرتی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ رسولِ عربیؐ نے جو پیغام نہایت لطف و کرم کے ساتھ دیا، عرب نے تیرہ برس تک اُس کو نہیں سُنا۔ اور اسی وجہ سے آپؐ کو تلوار کی زبان سے یہ پیغام دینا پڑا، اور اسی اصولِ فطرت کی بنا پر دس برس تک معرکۂ جہاد و قتال جاری رہا ——— !

لیکن اس معرکہ کی نوعیت عرب کی جنگوں سے بالکل مختلف تھی۔ کیونکہ اس کے ذریعے آپؐ نے دراصل اُس گراں قدر خونِ انسانی کو محفوظ رکھنا چاہا جس کو عرب کے ریگستانوں میں نہایت بیدردی سے بہایا جا رہا تھا۔ مگر کسی گراں قدر شے کے تحفظ کے لیئے بڑی بھاری ضمانت دینی پڑتی ہے اور خونِ انسانی کی حفاظت کے لیے خون ہی کی قربانی پیش کرنی پڑتی ہے ——— !

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ

اے عقلمند لوگو! قصاص کوئی بُری چیز نہیں ہے۔ بلکہ اس نے تمہاری زندگی کو قائم رکھا ہے۔ شاید تم اس کے ذریعے قتل و خونریزی سے بچو!

جنگ اور اسلام

"حرب" اور "اسلام" میں لغوی اعتبار سے یا ہجائی ترکیب کے لحاظ سے کوئی اشتراک یا مماثلت نہیں ہے۔ جنگ کے معنی سے ہر شخص واقف ہے اور اس کی تباہکاریوں سے دنیا کی تاریخ بھری پڑی ہے۔ اس کے برعکس اسلام کی غرض امن و سلامتی کا قیام اور خونِ انسانی کی حفاظت ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم فرماتا ہے۔

تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ مِنْ كُلِّ اَمْرٍ سَلٰمٌ

یعنی نزول قرآن کی رات میں خدا کے حکم سے فرشتے اور روح ہر قسم کے امن وسلام لے کر اترتے ہیں!

اسی لیے رسولِ عربی نے جنگ کی حقیقت میں جو انقلاب پیدا کیا ہے اس میں سب سے زیادہ نمایاں کارنامہ جنگ کے مقصد کو متعین کرنا اور اسے محض خون آشامی، غارت گری کے دائرے سے نکال کر ایک اعلیٰ اخلاقی اور مدنی نصب العین کی سطح تک لانا ہے۔ آپؐ سے پہلے جنگ کسی نیک مقصد کے لیے نہیں ہوتی تھی اور یہی وجہ تھی کہ کشت وخون کے بعد دنیا کو بجز ندامت کے کچھ اور نصیب نہیں ہوتا تھا۔ یہی کیفیت جدید یورپ کی تمام جنگوں کی ہے جن کی غرض جوع الارضی، مال و دولت، اور اقتدار اور انتقام کے سوا کچھ نہیں ہے۔ چنانچہ نپولین کہتا ہے

"جنگ وحشیانہ اور بُری حرکت ہے۔ خواہ وہ کتنی ہی شکلیں بدلے بہرحال وہ عہدِ وحشت کی ناگوار یاد ہے"

اور ولنگٹن کے خیال میں

"اگر تم ایک دن بھی جنگ دیکھ لو تو خدا سے دعا مانگو کہ پھر وہ تمہیں روزِ جنگ نہ دکھائے"

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے عرب میں جنگ کے لیے جو الفاظ، محاورے، ترکیبیں اور استعارے استعمال ہوتے تھے وہ سب کے سب صرف ایک وحشیانہ جنگ کے تصور کو پیش کرتے تھے لیکن سرورِ کائنات نے حقیقتِ جنگ کے ساتھ ساتھ ان تمام الفاظ اور محاورات وغیرہ کو متروک کر دیا اور غزوات اسلامیہ کو "جہاد" کی اصطلاح دی جس کے لغوی معنی ہیں "کسی کام یا مقصد کے لیے کوشش صرف کرنا" اس پاکیزہ اصطلاح سے آپؐ نے نہ صرف اسلامی جنگ کے بے لوث مقصد کو متعین کیا بلکہ اس کو عزتِ نفس کی بلندی بھی عطا کی، برق کی توانائی بخشی، ملائکہ کی معصومیت اور الوہیت کی شان بے نیازی بخش دی ——— ! آپؐ نے اس غرض کے لیے پہلے نیتوں کو درست کیا اور یہ واضح فرمایا کہ جہاد قتل و غارت، سیادتِ ارضی، حصولِ اقتدار، عزت و تکریم یا اظہارِ شجاعت

کے لیے نہیں کیا جاتا بلکہ اس کا مقصد صرف اعلائے کلمۂ حق اور خدا کے احکام کی تعمیل ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ :-

"جس شخص نے اس نیت سے لڑائی کی کہ خدا کا بول بالا ہو اور اس کی سچائی قائم کی جائے تو صرف اسی کا قتال خدا کی راہ میں ہے۔"

اس جہاد کا اصول یہ ہے کہ افراد کی طرح جماعتیں بھی سرکش اور فتنہ پرداز ہو جاتی ہیں۔ اس لیے جس طرح ظالم انسان کو سزائے موت دی جاتی ہے اسی طرح اجتماعی فتنہ کی صورت میں نظام تمدن کے تحفظ کے لیے خون کی ندیاں بھی بہانی پڑتی ہیں اور عقل و مصلحت کا تقاضہ یہی ہوتا ہے کہ ایک قابل سرجن کے عمل جراحی کی طرح اس فاسد اور مفسد عضو ہی کو کاٹ کر پھینک دیا جائے جو اجتماعی نظام میں زہریلے اثرات پھیلانے کا باعث ہو رہا ہے۔

وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ

یعنی فتنہ قتل سے زیادہ شدید ہوتا ہے ..... لہذا نبی کریم کی جنگوں کا مدعا فتنہ و فساد سے سطح ارض کو پاک کرنا ہے اور انسان کو اس قابل بنانا ہے کہ وہ باطل اور ظلم کے تسلط کو کبھی قبول نہ کرے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے ہر معاملہ میں صبر و تحمل کی تاکید کی ہے لیکن کسی ایسے حملہ کو برداشت کرنے کی تعلیم نہیں دی جو انسان کو مرعوب و مغلوب کرنے اور باطل و ظلم کو مسلط کرنے کے لیے کیا جائے۔

۱۔ مدافعت اسلام نے مندرجہ ذیل صورتوں میں جنگ کو جائز قرار دیا ہے ہر فرد اور ہر قوم کو ہمیشہ یہ حق حاصل ہونا چاہیے کہ وہ اپنی حفاظت کے لیے حملہ آور سے جنگ کرے، اور اُسے نقصان پہنچائے۔ چنانچہ اسلام نے بھی انسان کے اس بنیادی حق کو نہ صرف تسلیم کیا ہے بلکہ حملہ کی صورت میں جنگ کی ہدایت بھی کی ہے۔ فرمایا گیا کہ

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ

یعنی جو لوگ تم سے لڑتے ہیں اُن سے خدا کی راہ میں تم لڑو۔

یہ حکم انسانی نفسیات اور بقائے حیات کے لوازمات کے عین مطابق ہے۔ اگر حملہ کا جواب حملہ سے نہ دیا جائے تو قوموں کا وجود خطرہ میں پڑ جائے گا یا وہ غلام اور محکوم بنالی جائیں گی اور اُن کی تہذیب و تمدن کو مٹا دیا جائے گا۔ نیز حملہ کی صورت میں جب کہ زندگی تاریکیوں میں چھپ جاتی ہے، بیوی اور بچوں، عزیز و اقارب، اور دوست و احباب کے رشتۂ محبت کے منقطع ہونے کا ہر وقت امکان رہتا ہے، جب کہ ہاتھوں سے ہر عزیز شے کا دامن چھوٹا جاتا ہے اور موت نگاہوں کے سامنے رقص کرنے لگتی ہے، کسی شخص کو امن کی تلقین کرنا یا تلوار کو نیام میں رکھنے اور حملہ آور کے سامنے گردن جھکا دینے کا حکم دینا نہ صرف حریت کے خاتمہ اور ظلم و استبداد کی ہمت افزائی کے مترادف ہے بلکہ اخلاق کے تمام بنیادی اصولوں اور انسانی نفسیات کے بھی عین مغائر ہے!

۲۔ حقوق کی حفاظت اسلام نے حکم دیا ہے کہ ہر اس شخص اور اس قوم کے خلاف جنگ کی جائے جو ہمارے حقوق غصب کرنے کی کوشش کرے، ہماری جائداد پر قابض ہو جائے، ہماری آزادیٔ ضمیر کو چھیننے اور اجتماعی نظام کو درہم برہم کرنے کی سعی کرے۔ حکم دیا گیا ہے کہ:

وَاقْتُلُوهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ وَأَخْرِجُوهُم مِّنْ حَيْثُ أَخْرَجُوكُمْ وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۚ

یعنی ان ظالموں کو جہاں پاؤ قتل کرو اور جہاں سے انہوں نے تمہیں نکالا ہے وہاں سے انہیں نکال باہر کرو، کیونکہ یہ فتنہ قتل سے زیادہ بُری چیز ہے۔

اسلامی مملکتوں کے تحفظ کا یہ حکم بہت واضح ہے اور اسی کے تحت اسلامی نظام اور اسلامی ممالک پر حملہ کی صورت میں ہر مسلمان پر جہاد کے فرض کو قطعیت کے ساتھ عائد کیا گیا ہے۔

۳۔ ظلم کا انسداد مظلوم کی حمایت ایک مقدس انسانی جذبہ ہے۔ دنیا کا نظامِ عدل اسی بنیاد پر استوار ہے۔ اور جانب از

قوموں نے اسے بہت عزیز رکھا ہے۔ چنانچہ باری تعالیٰ نے بھی جواز جنگ کے متعلق جو پہلی آیت سرورِ کائنات پر نازل فرمائی ہے۔ اس کی غرض مظلوم انسانوں اور مقہور قوموں کی اعانت اور دستگیری ہی ہے! فرمایا گیا۔

اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقَاتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ۝ نِ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ۔

یعنی جن لوگوں سے جنگ کی جا رہی ہے انہیں جنگ کی اجازت دے دی گئی کیونکہ وہ مظلوم ہیں اور اللہ ان کی مدد پر یقیناً قدرت رکھتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے گھروں سے ناحق نکالے گئے ہیں، صرف اس قصور پر کہ وہ کہتے تھے صرف اللہ ہی ہمارا رب ہے ......

اس حکم سے ظاہر ہے کہ ظلم کی مندرجہ ذیل صورتوں میں جنگ جائز ہے۔

(الف) مسلمانوں کے جائز حقوق کا چھینا جانا۔

(ب) اُن کا ملک بدر کیا جانا۔

(ج) اُن کے اقتدار کا سلب کر لیا جانا۔

(د) عقائد کی وجہ سے ان پر جور و ستم کا ڈھایا جانا

(۲) راہِ حق کی حفاظت قرآن مجید نے دینِ حق کو صراطِ مستقیم سے تعبیر کیا ہے۔ اور اس صراطِ مستقیم یا سبیل اللہ یا اللہ کی راہ سے روکنے والے کے خلاف جنگ کا حکم دیا ہے۔

اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ ......

...... فَاِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ حَتّٰى اِذَا اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا

یعنی جن لوگوں نے دینِ حق کو ماننے سے انکار کر دیا اور اللہ کی راہ سے روکنے لگے ان کے اعمال اللہ نے ضائع کر دیئے ...... پس جب تمہاری ان منکروں سے

مڈبھیڑ ہو تو گردنیں مارو یہاں تک کہ اُن کی طاقت کو کچل ڈالو۔ اس کے بعد قید کی گرفت کو مضبوط کرو اور انہیں گرفتار کر لو، پھر تمہیں اختیار ہے کہ خواہ احسان کا معاملہ کرو یا فدیہ لے لو۔ یہ عمل اس وقت تک جاری رکھو جب تک جنگ اپنے ہتھیار نہ ڈال دے اور اس کی ضرورت ہی باقی نہ رہے۔

اس حکم کے تحت حسب ذیل گروہوں سے جنگ لازم آتی ہے۔

(ا) جو لوگوں کو اسلام قبول کرنے سے روکتے ہیں۔

(ب) جو مسلمانوں کو جبراً مرتد بناتے ہیں۔

(ج) جن کی کوششوں کے باعث مسلمان اپنی زندگی اسلامی احکام کے مطابق بسر نہ کر سکیں اللہ کی راہ سے روکنے والوں کی بھی کئی قسمیں ہو سکتی ہیں۔ مثلاً وہ جو قوت کے استعمال سے ایسا کرتے ہوں یا دولت کے زور سے اِس کی تکمیل چاہتے ہوں۔ یا وہ جو سازشوں اور جوڑ توڑ کے ذریعے اپنے مقصد کو حاصل کرنے کی سعی کرتے ہوں ——— ان سب کے خلاف جنگ کرنا مسلمانوں کا ایک اہم فرض ہے۔

۵۔ فتنہ و فساد کا انسداد فتنہ سے مراد ناحق خونریزی اور غارت گری بھی ہے اور کمزوروں پر جور و ستم، لوگوں کو گمراہ کرنے کی کوشش، حق کی مخالفت، اور ناجائز اغراض کے لیے جنگ بھی اس تعریف میں شامل ہے فساد سے مراد اجتماعی اخلاق اور نظام تمدّن و سیاست میں بے اعتدالی ہے۔ قرآن نے ان دونوں صورتوں یعنی فتنہ و فساد کے استیصال کا حکم دیا ہے۔ کیونکہ قرآنی بصیرت کے مطابق فتنہ قتل سے زیادہ شدید ہوتا ہے۔ اور ایسی حالت میں جنگ سے گریز کا نتیجہ انسان کے لیے انتہائی مہلک ثابت ہوتا ہے۔ فرمایا گیا کہ۔

قَاتِلُوهُمْ حَتّٰى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ لِلّٰهِ :

یعنی اُن سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین صرف اللہ کے لیے ہو!

اور وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ

اور فتنہ قتل سے زیادہ بُری چیز ہے۔

قرآن نے ایسی طرزِ حکومت کو بھی فساد سے تعبیر کیا ہے جس کے مقاصد بد ہوں۔۔۔۔ درحقیقت فتنہ و فساد کی جڑ ایک حق ناشناس حکومت ہوتی ہے جس کے تحت انصاف کا خون کیا جاتا ہے، حیاسوز قوانین بنائے جاتے ہیں اور عوام کو لڑائی کی آگ میں جھونک دیا جاتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اسلام نے حکم دیا ہے کہ منظم جدوجہد اور ضرورتاً جہاد کے ذریعے ایسی تمام بدکار حکومتوں کا استیصال کیا جائے۔

لَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا

یعنی اُس کی اطاعت نہ کر جس کے دل کو ہم نے اپنے ذکر سے غافل کر دیا ہے، جو اپنی نفسانی خواہشات کی پیروی کرتا ہے اور جس کا حکم زیادتی پر مبنی ہے۔

اور اِتَّبَعُوْا اَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ فَاتْبِعُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً وَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ،

یعنی انہوں نے ہر جبار دشمنِ حق کی پیروی کی۔ پس ان پر اس دنیا میں بھی لعنت پڑی اور یوم قیامت کو بھی پڑے گی۔

اور ایک جگہ فرمایا گیا کہ اُن حاکموں کی اطاعت نہ کرو جو زمین میں فساد پھیلاتے ہیں اور اصلاح نہیں کرتے۔

لَا تُطِيْعُوْا اَمْرَ الْمُسْرِفِيْنَ هُمْ يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ

گویا ظالم، جابر، نفس پرست حکام کی اطاعت دینی اور دنیوی تباہی و بربادی کا باعث ہوتی ہے۔ اسی لیے ان کی مخالفت اور ان سے جنگ انسانی معاشرہ کی فلاح کے لیے ضروری ہے ——— حضرت امام حسینؑ نے اسی قرآنی تعلیم کے مدنظر یزید کی حکومت کے خلاف اعلانِ جنگ کیا اور مادّی وسائل کی کمی، بے بسی اور بے سروسامانی کے باوجود راہِ حق کی حفاظت کے لیے اپنا آخری قطرۂ خون تک بہا دیا۔۔۔۔!

۶۔ کفار اور منافقین سے جنگ

ایسے کافر اور منافق جو اسلامی مملکت کے اندر بدامنی اور خلفشار پیدا کر کے حکومت

اسلامیہ کی جڑوں کو کھوکھلا کرنا چاہتے ہوں اُن سے بھی جنگ اور جہاد کا حکم قرآن نے دیا ہے۔

یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ جَاھِدِ الْکُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِیْنَ وَاغْلُظْ عَلَیْھِمْ،

یعنی اے نبی منافقوں اور کافروں سے جہاد کرو اور ان پر سختی کرو۔

اور اُن کی سزا یہ بتائی گئی ہے کہ

فَخُذُوْھُمْ وَاقْتُلُوْھُمْ حَیْثُ وَجَدْتُّمُوْھُمْ وَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْھُمْ وَلِیًّا وَّلَا نَصِیْرًا

انہیں پکڑو اور جہاں پاؤ مارو اور ان میں سے کسی کو اپنا دوست نہ بناؤ۔

ملک کے اندر دشمن عناصر کا وجود ہمیشہ خطرناک ہوتا ہے چنانچہ عہد حاضر میں بھی ایسے لوگوں کو سخت سزا دی جاتی ہے جو قوم میں انتشار پیدا کرنے اور حکومت کا تختہ اُلٹ دینے کی سازشیں کرتے ہیں۔ نیز آج کل جنگ میں کامیابی کے لیے یہ ضروری سمجھا جاتا ہے کہ دشمن کے ملک میں اپنا "پانچواں کالم" پہلے ہی سے داخل کر دیا جائے جو اس مُلک میں داخلی بدامنی پیدا کرے، لوگوں کو بھڑکائے اور اُن کے حوصلوں کو پست کر دے۔ اسلام نے بھی ایسے عناصر کی سرکوبی اور جاسوسوں کے استیصال کی سختی سے تاکید کی ہے تاکہ نہ صرف مسلم رعایا دشمنی کے زہریلے اثرات سے محفوظ رہ سکے بلکہ جنگ کے دوران میں بھی کسی اندرونی خلفشار کے باعث حکومت کو مشکلات کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

۷۔ عہد شکنی

قرآن حکیم اُن لوگوں سے بھی جنگ کا حکم دیتا ہے جو عہد کر کے توڑ دیتے ہیں، یا معاہدہ کے نفاذ کے باوجود معاندانہ رویّہ اختیار کرتے ہیں، یا جو مسلمانوں کو ہمیشہ نقصان پہنچاتے رہتے ہیں اور جن کے عہد پر کوئی بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ فرمایا گیا کہ۔

وَاِنْ نَّکَثُوْٓا اَیْمَانَھُمْ مِّنْۢ بَعْدِ عَھْدِھِمْ وَطَعَنُوْا فِیْ دِیْنِکُمْ فَقَاتِلُوْٓا اَئِمَّةَ الْکُفْرِ،

یعنی اگر وہ عہد کرنے کے بعد اپنی قسموں کو توڑ دیں اور تمہارے دین پر حملہ کریں تو

کفر کے لیڈروں کے ساتھ جنگ کرو۔

۱۱۔ اَلَّذِیْنَ عَاهَدْتَّ مِنْهُمْ ثُمَّ یَنْقُضُوْنَ عَهْدَهُمْ فِیْ كُلِّ مَرَّةٍ وَّهُمْ لَا یَتَّقُوْنَ فَاِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِی الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِمْ مَّنْ خَلْفَهُمْ لَعَلَّهُمْ یَذَّكَّرُوْنَ ۔

یعنی یہ وہ لوگ ہیں جن سے تو نے معاہدہ کیا تھا مگر وہ بار بار اپنے عہد کو توڑتے ہیں اور بد عہدی سے پرہیز نہیں کرتے۔ پس اگر تو جنگ میں ان کو پائے تو انہیں سخت سزا دے کر ان لوگوں کو خوفزدہ و پراگندہ کر دے جو ان کے پیچھے ہیں شاید کہ وہ کچھ سبق حاصل کریں۔

۸۔ قیامِ امن

دارالسلام میں نقضِ امن کی کوشش سنگین جرم ہے۔ وہ لوگ جو کسی نہ کسی طرح فساد پھیلا کر حکومت اسلامی کو درہم برہم کرنا چاہتے ہیں اس قابل ہیں کہ انہیں بدترین سزا دی جائے۔ چنانچہ باری تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو لوگ اللہ اور اُس کے رسول سے لڑتے ہیں اور ملک میں فتنہ پیدا کرنے کی سعی کرتے ہیں، اُن کی سزا یہ ہے کہ وہ قتل کئے جائیں، یا صلیب پر چڑھا دیئے جائیں، یا اُن کے ہاتھ پاؤں مخالف سمتوں سے کاٹ ڈالے جائیں یا وہ ملک سے نکال دیئے جائیں۔

۹۔ امر بالمعروف ونہی عن المنکر

مسلمانوں کی جدوجہد کا مقصد دنیا کو راہِ راست پر لانا ہے۔ قرآن مجید فرماتا ہے کہ:-

كُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۔

یعنی تم ایک بہترین امت ہو جسے لوگوں کی خدمت و ہدایت کے لیے برپا کیا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم کرتے ہو اور بدی کو روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔ اس سے واضح ہے کہ مسلمانوں پر تمام نوعِ انسانی کی خدمت کا فرض عائد کیا گیا ہے۔ اس لیے سطحِ ارض پر جہاں بھی فساد برپا ہو، ظلم و استبداد کا دور دورہ ہو یا برائیں

کو فروغ حاصل ہو رہا ہو، مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہاں پہنچیں، لوگوں کو نیکی کی تعلیم دیں اور ان کو برائی سے روکیں ——— اس غرض کے لیے سرورِ کائنات نے ضرورتاً قوت کے استعمال کا بھی حکم دیا ہے اور فرمایا ہے کہ :

"تم میں سے جو کوئی بدی کو دیکھے تو اس کو ہاتھ سے بدل دے۔ اگر اس کی قدرت نہ رکھتا ہو تو زبان سے اور اگر اس کی بھی قدرت نہ رکھتا ہو تو دل سے اور یہ (آخری) ایمان کا ضعیف ترین درجہ ہے"

یعنی مسلمانوں میں اگر اتنی قوت ہو کہ تمام دنیا کو برائی سے بچا کر نیک بنا سکیں تو ان کا یہ عین فرض ہے کہ وہ اپنے تمام وسائلِ قوت کو مرکوز کر کے نوعِ انسانی کو صراطِ مستقیم پر لائیں اور زمین کے چپہ چپہ پر خدائے قدوس کے قانونِ عدل کو نافذ کر دیں۔

ان تمام صداقتوں سے واضح ہے کہ اسلام صرف مدافعت کے لیے جنگ کی تعلیم دیتا ہے۔ جس کی غرض یہ ہے کہ مسلمان بیرونی اور اندرونی دشمنوں کے حملوں اور ریشہ دوانیوں سے محفوظ ہو کر اس فرض کی تکمیل کے لیے اپنی صلاحیتوں کو مصروفِ عمل کر دیں جو کہ اہلِ جہاں کی فلاح و بہبودی کے لیے خداوند عالم کی طرف سے ان پر عائد فرمایا گیا ہے ——— لیکن جنگ کے ان سب احکام پر اعتدال کی شرط عائد کی گئی ہے کہ :

وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ ؁

یعنی (لڑائی میں) حد سے تجاوز نہ کرو کیونکہ اللہ تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

عام طور پر جنگوں میں جب کہ غیض و غضب معراجِ کمال پر ہوتا ہے، فریقین ایک دوسرے کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں اور بالخصوص فاتحین اپنے جذبۂ انتقام کے تحت ایسی شدید وحشت اور بہیمیت کا مظاہرہ کرتے ہیں کہ جس کا اثر معصوم اور بے گناہ انسانوں پر بھی پڑتا ہے اور اس طرح نہ صرف خونریزی حدودِ اعتدال سے گزر کر انتہا کو پہنچ جاتی ہے۔ بلکہ لوٹ اور غارت گری کے باعث مفتوح اقوام کی تہذیب و تمدن کا بھی شدید نقصان ہوتا ہے اور انسان کی لطیف اور اعلیٰ قدریں تباہ اور پامال ہو جاتی ہیں ——— اسلام نے اسی انتہا پسندی پر تحدید

عاید کی ہے۔ اور ان خطرناک صورتوں کے ازالہ کے لیئے واضح حکم دے دیا ہے کہ ضرورت سے زیادہ قوت کا استعمال اور حدود اعتدال سے تجاوز عذاب الہی کا مستوجب ہوتا ہے ـــــ!

تلوار کی طاقت


جنگ کے یہ مقاصد، شرائط اور حدود ہیں جن کے تحت رسول عربی میدان جنگ کی طرف قدم بڑھاتے ہیں۔ آپ مفسد جماعتوں کا استیصال چاہتے ہیں اور خونریز فتنہ کو اُسی کے خون میں غرق کر دیتے ہیں ـــ لیکن کوئی شخص اس جنگ کو ناجائز سمجھتا ہو اور اس کی روح خون کے سیلاب کی اٹھتی ہوئی طوفان خیز موجوں سے کانپ جاتی ہو تو ایسا انسان دنیا کی اصلاح نہیں کر سکتا۔ وہ جائے جنگلوں اور پہاڑوں میں، اور وہاں جا کر تقویٰ اور ریاضت سے اپنی روح کو تسکین پہنچائے۔ مگر اس کی تعلیم بدی، ظلم اور سرکشی کا خاتمہ نہیں کر سکتی، جماعتوں کی اخلاقی تربیت نہیں کر سکتی، قوموں کی عزت اور زندگی کی حفاظت نہیں کر سکتی، ـــــ

درحقیقت امن وعافیت، زندگی اور حکومت، اور مال و دولت کی حفاظت کے لیے طاقت کی ضرورت ہوتی ہے، اور تاریخ عالم بتاتی ہے کہ اصلی طاقت تلوار کی طاقت اور زندگی کا سرچشمہ آبِ حیات ہمیشہ خون کی ندیوں اور فواروں ہی میں رہا ہے۔ دنیا میں آج تک کوئی دور ایسا نہیں گزرا جب کہ تلوار کی طاقت کمزور پڑ گئی ہو، یا خون کی ندیوں اور فواروں سے حیات بخشنے کی تاثیر زائل ہو گئی ہو۔ وہ لوگ بہت مقدس ہیں جو سطح ارض کو خونریزی سے پاک کر کے اسے معصوم فرشتوں کی دلفریب جنت میں بدل دینا چاہتے ہیں اور یو۔ این۔ او کی ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھ کر ایسے مسائل کا حل دریافت کرنا چاہتے ہیں جن کا حل کہ تاریخ اور قدرت نے ہمیشہ جنگ کے میدانوں ہی میں پیش کیا ہے! اس حسین تصور پر کون دل سے فریفتہ نہ ہو گا لیکن اس کو کیا کیجئے کہ، دنیا آرزوؤں اور تمناؤں کی نہیں بلکہ تلخ حقائق کی جگہ ہے جہاں تلوار ہی زندگی کی ضامن اور مظلوم کے ہاتھ میں اُس کی حفاظت کی آخری ڈھال ہے۔!

یہ زورِ دست و ضربتِ کاری کا ہے مقام
میدانِ جنگ میں نہ طلب کر نوائے چنگ

باب دوسرا

جنگ



جنگ کے اجزائے ترکیبی
سپہ سالار
سپاہی
اخلاقی حالت
وسائل
جنگ کے اصول
اصلی مقصد کا پیشِ نظر ہونا
اقدام
اقدام کے اصول
اچانک حملہ
اجتماع
فن لشکر کشی
حفاظت
کفایت
حرکت پذیری
تعاون
عناصرِ ثلاثہ
زمین
موسم
اتفاقات
جاسوسی
فوجوں کا استعمال
زمین کا استعمال
دفاع
رسد
حربی چالیں
(tactics)
تعاقب
دفاعی منصوبہ
نوعیتِ جنگ کا اندازہ
صحیح تربیت
اسلحہ کی فراہمی
تدبر
حملہ کیلئے تجویز کردہ
منصوبہ کی سادگی
جنگ کی تیاری
اندرونی استحکام
عوام کی اخلاقی تربیت
مادی وسائل کی فراہمی
ہمسایہ ممالک سے تعلقات
پروپیگنڈا
تیاری اسلحہ
اسلحہ کے استعمال کی تربیت
کا انتخاب

رسولِ عربی کی جنگیں

فنِ حرب کے پس منظر میں

مگر مسلمانوں کا سالار اپنی جگہ یقینِ محکم کے ساتھ کھڑا رہتا ہے ۔
وہ ایک سچے خدا کے سچے رسول کے وقار کے ساتھ کھڑا ہے،
جیسے برق کی توانائیاں مرتکز ہو گئی ہوں، جیسے آندھیوں کی تندی
ایک نقطہ پر سمٹ آئی ہو، جیسے طوفان کی تیزی متشکل ہو گئی
ہو، جیسے خدائے قہار کی قوتِ ارادی انسانی روپ میں آ گئی ہو!

موضوع کی افادیت

جنگ کی تاریخ کی اہمیت

عہد جدید میں سائنس اور علوم و فنون کی ترقی سے جنگ کی شکل و صورت میں انقلاب آگیا ہے۔ نئے نئے آلات حرب کی ایجاد اور ذرائع حمل و نقل میں حیرت انگیز ترقی کے پس منظر میں قدیم زمانہ کی جنگیں بازیچہ اطفال معلوم ہونے لگتی ہیں ـــــ لیکن اس کے باوجود عہد قدیم کی جنگوں کی تاریخ کے مطالعہ کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ لفٹیننٹ جنرل آلفریڈ ایچ برن اپنی کتاب "The art of war on Land" میں لکھتا ہے کہ جنگ کے آٹھ بنیادی اصول ہیں جو زمانہ قدیم میں بھی اُسی طرح اہم تھے جیسے کہ آج ہیں۔ اور لفٹیننٹ جنرل سر فرانسس ٹوکر اپنی کتاب "Pattern of war" میں لکھتا ہے کہ:-

"روائتی طریقۂ جنگ ہمیشہ سے رہا ہے۔ یہ طریقۂ جنگ نہ صرف یورپ کی اٹھارویں صدی کی متحرک جنگوں میں پایا جاتا ہے بلکہ اُس سے بہت پہلے ہنی بال اور اُس سے قبل کے زمانہ میں بھی نظر آتا ہے۔ اس حقیقت سے طریقۂ جنگ کی اس حیرت انگیز یکسانیت پر روشنی پڑتی ہے جو جنگوں سے ارتقا میں پائی جاتی ہے اور جس کے تحت دنیا کی جنگیں لڑی گئی ہیں۔"

انگلستان کے دفتر جنگ کے "قواعد تربیت" میں اسی تاریخ کے مطالعہ کی اہمیت اس طرح بیان کی گئی ہے کہ:-

"...... فوجی تاریخ کو بلا شک و شبہ اس قسم کے مطالعے میں سب سے

اہم جگہ ملنی چاہیے کیونکہ اصول جنگ کے صحیح مفہوم اور اُن کے اطلاق کو سمجھنے اور یہ معلوم کرنے کا کہ ہر حربی کاروائی میں انسانی فطرت ہی سب سے زیادہ موثر حصّہ لیتی ہے، یہی سب سے بہتر ذریعہ ہے۔"

اور "فوجی تاریخ کے مطالعہ کا مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ گذشتہ فوجی معرکہ آرائیوں کی یادداشت سے ایسے سبق حاصل کئے جائیں جن کا اب اطلاق ہو سکے لیکن یہ مطالعہ اگر اس غرض سے ہو کہ محض تاریخی واقعات کا علم ہو جائے تو اس سے کچھ زیادہ فائدہ نہیں ہو سکتا۔ زمانہ حال کی فوجوں کی کثرت اور اُن کے ترقی یافتہ اسلحہ اور ذرائع حمل و نقل کے باعث ماضی سے حاصل ہوئے والے بہت سے سبق حال پر منطبق نہیں ہو سکتے۔ لیکن انسان کی فطرت اور وہ قواعد جن پر جنگ مبنی ہوتی ہے، نہیں بدلتے۔ اور یہی وجہ ہے کہ نہایت قدیم زمانے کی معرکہ آرائیوں سے بھی قیمتی سبق سیکھے جا سکتے ہیں"!

غزوات کی تاریخ کی اہمیت

رسول عربی کی جنگیں اپنی نوعیت کے اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ مدینہ کی ایک شہری مملکت اپنے مٹھی بھر سپاہیوں کے ساتھ دس سال کے اندر دس لاکھ مربع میل سے زیادہ رقبہ فتح کر لیتی ہے، اکثر دشمن کی دُگنی اور تگنی قوت کے سرِ غرور کو کچل دیتی ہے۔ اور ساتھ ہی انسانی خون کی حرمت کی ایسی مثال پیش کرتی ہے کہ جس کی نظیر تاریخ کے کسی دور میں تلاش کرنا بے سود ہے۔ اور اس لحاظ سے میدان جنگ میں محمد عربی کی حربی مہارت، عسکری صلاحیت، ذاتی شجاعت اور آپ کی فوجوں کی اخلاقی حالت کا مطالعہ صرف تاریخِ جنگ اور فن حرب کے طلبہ ہی کے لیے مفید نہیں ہو گا بلکہ ہر مسلمان کے لیے بھی جس پر دنیا کے فتنہ و فساد کے انسداد کی اہم ذمہ داری عائد ہوتی ہے بصیرت افروز ثابت ہو گا ——— لیکن ان امور کا صحیح اندازہ کرنے کے لیے جنگ کے اجزائے ترکیبی اور بنیادی اصولوں کا معلوم کر لینا بھی ضروری ہے کیونکہ فنِ حرب کی مبادیات سے واقفیت کسی جرنیل کی شخصیت اور

اُس کے کارناموں کو سمجھنے کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ اِسی نقطہ نظر سے کتاب ہٰذا میں آنحضرت صلعم کی جنگوں پر تبصرہ کے ساتھ ساتھ جنگ کے اصولوں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور فنِ جنگ اور اور تاریخ کی چند مشہور لڑائیوں کے پس منظر میں آپؐ کی شخصیت اور حربی بصیرت کی وضاحت کی سعی کی گئی ہے!

رسولِ عربی صلعم کی جنگوں کا تاریخی پس منظر

دعوتِ توحید

۶۱۰ء میں نزولِ وحی کے بعد رسولِ کریمؐ نے شہر مکّہ سے توحید کی دعوت دینا شروع کی۔ یہ دعوت ملک کے بت پرستانہ مذہبی نظام کو ایک چیلنج اور قدیم رسمُ رواج پر ضربِ کاری ہونے کے باعث عوام کے لیے ناقابلِ قبول تھی۔ نیز آپؐ کی قیادت اقتدار کو ایک جونیئر گھرانے میں منتقل کرنے کا سبب بن رہی تھی۔ اِس لیے سینیئر گھرانا آپؐ کی مخالفت پر اُتر آیا اور خود آپؐ ہی کے خاندان کے بزرگ افراد آپؐ کی سرداری کے خلاف ہو گئے۔

سفرِ طائف

سرورِ کائنات نے اپنی جدوجہد کو صبر آزما حالات میں جاری رکھا لیکن آٹھ، دس سال کا طویل عرصہ گزر جانے کے باوجود اہلِ مکّہ نے آپؐ کی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔ آپؐ کی عزیز بیوی حضرت خدیجہؓ اور شفیق چچا حضرت ابوطالب کا انتقال ہو گیا جس کے باعث آپؐ کی مشکلات میں اضافہ ہوتا گیا۔ لوگ آپؐ کے خون کے پیاسے ہو گئے۔ اور سارے شہر والوں نے آپؐ کا مکمل بائیکاٹ کر دیا۔ اِن حالات میں آپؐ مکّہ چھوڑ کر طائف چلے جانے پر مجبور ہوئے کیونکہ وہاں آپؐ کے ماموں کا خاندان بنو عبد بستا تھا اور آپؐ کے دوسرے چچا حضرت عباس بھی اپنے کاروبار کی بدولت وہاں رسوخ رکھتے تھے۔ وہاں پہنچ کر آپؐ نے اپنی تحریک جاری رکھی۔ لیکن طائف کے باشندے اسلام کی تعلیم کو روا نہیں رکھ سکتے تھے کیونکہ اہلِ مکّہ کو ناراض کرنے سے انہیں سخت مالی نقصان کا اندیشہ تھا کیونکہ طائف کے مال کی نکاسی کی منڈی تھا۔ اور ہر سال موسمِ گرما میں مکّہ کے تاجر اور خوشحال خاندان طائف پہنچ کر وہاں کی آمدنی میں اضافہ کا سبب ہوتے تھے۔ نیز اہلِ طائف کی بت پرستی بھی دعوتِ اسلام کی راہ میں حائل تھی ــــــــ نتیجہ یہ ہوا کہ طائف میں آپؐ کو سخت عقوبتیں دی گئیں اور

آپ کو لہو لہان کردیا گیا۔ اور جب بہتری کی کوئی صورت نظر نہیں آئی تو آپ کو مجبوراً مکہ لوٹ جانے کا تصفیہ کرنا پڑا۔

بیعت عقبہ مکہ میں جان کے خطرات ہر روز بڑھتے ہی جا رہے تھے۔ اس لیے آپ شہر سے باہر ٹھہر گئے اور مختلف ذرائع سے شہر کے ذی اثر سرداروں کو پیام دیتے رہے کہ وہ آپ کو اپنی حفاظت میں لے لیں ——— ایک سردار نے آپ کو اس شرط پہ پناہ دی کہ آپ شہر کے اندر تبلیغ نہیں کریں گے۔ شہر کے باہر کوئی پابندی نہیں تھی۔ اس لیے حج کے مواقع پہ آپ لوگوں کو اپنا پیام دیتے گئے اور اپنی دعوت کا مقصد انہیں سمجھاتے رہے۔ سنہ ۱۳ ق۔ ھ میں آپ نے منا میں پندرہ جماعتوں سے یکے بعد دیگرے گفتگو کی اور انہیں اپنی تحریک کی افادیت سے آگاہ کیا۔ آپ نے کہا کہ مجھے اپنے ملک لے چلو اور اپنی حفاظت میں اس تحریک کو چلانے دو۔ بہت جلد تم نہ صرف پورے عرب کے سردار ہو جاؤ گے بلکہ قیصر و کسریٰ کے خزانے بھی تمہارے پاؤں میں نچھاور ہو جائیں گے۔ لیکن قریش کا ایک نمائندہ ہر وقت آپ کے ساتھ لگا رہتا تھا جو لوگوں کو ورغلاتا کہ یہ (نعوذ باللہ) دیوانہ ہے، پاگل ہے، جادوگر ہے، اور اگر تم اس کی مدد کرو گے تو اہل قریش اس فعل کو اپنے خلاف اعلان جنگ قرار دیں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کسی نے آپ کا مذاق اڑایا، کسی نے اظہارِ غضب کیا، کسی نے آپ کی تحریک کو محض پاگل پن قرار دیا، اور کسی نے قریش کی خفگی کا حیلہ کر کے اپنا دامن بچالیا ——— لیکن آپ کے استقلال میں کوئی فرق نہیں آیا، پائے ثبات میں کوئی تزلزل واقع نہیں ہوا، اور اپنے مشن کی صداقت کے بارے میں آپ کے دل میں کوئی شبہ تک پیدا نہ ہو سکا۔ آپ نے مایوسی کو نزدیک نہیں آنے دیا۔ بلکہ پورے عزم اور حوصلہ کے ساتھ اپنا کام جاری رکھا ——— عقبہ کے مخفوظ مقام پہ مدینہ کے پانچ، چھ آدمیوں سے آپ کی ملاقات ہوئی۔ انہوں نے داعیٔ اسلام کے پیام کو شوق سے سنا اور آپ کو اپنے مکمل تعاون کا یقین دلایا۔ یہ لوگ مدینہ کے قبیلہ خزرج کے افراد تھے۔ آپ کی والدہ ماجدہ کا تعلق بھی اسی قبیلہ سے تھا۔ اور آپ کے چچا حضرت عباس بھی اپنے کاروبار کے سلسلہ میں مدینہ سے گزرا کرتے تھے۔

مدینہ کے حالات اس امر کے متقاضی تھے کہ کوئی حوصلہ مند شخص وہاں پہنچ کر اہل مدینہ

کے مسائل کو سلجھائے۔ وہاں کئی یہودی قبیلے آباد تھے جن میں سے کچھ تو قبیلہ خزرج کے دوست اور کچھ دشمن تھے۔ ان یہودیوں کا عقیدہ تھا کہ مسیح موعود آکر اُن کے دشمنوں کو مغلوب کرے گا۔ نیز قبیلہ اوس سے قبیلہ خزرج کی قدیم دشمنی چلی آتی تھی، اور باہمی جدال و قتال سے وہ تھک چکے تھے، اور چاہتے تھے کہ کوئی غیر مدنی ایک مشترک سردار کی حیثیت سے اُن کی تمام نزاعات کو ختم کردے ــــــ لہذا جب اُن پانچ، چھ آدمیوں نے جو مقام عقبہ آپ سے گفتگو کر چکے تھے مدینہ میں آپ کی شخصیت اور دعوت کا چرچا کیا تو دوسرے حج کے موقع پر دونوں قبیلوں کے بارہ سرداروں نے عقبہ ہی کے مقام پر آپ سے ملاقات کر کے اسلام قبول کر لیا۔ اُن کے ساتھ ایک تربیت یافتہ مبلغ مکہ سے بھیجا گیا جس نے دونوں قبیلوں کے متعدد ذی اثر اشخاص کو اسلام کا حامی بنایا اور اُن سے عہد لیا کہ آنحضرت صلعم کی ذات اُن کی باہمی رقابت سے بالاتر رہے گی۔

سلہ ق ھ میں مدینے کے مزید بہتر مردوں اور عورتوں نے جو حج کے لیے مکہ آئے ہوئے تھے اسی عقبہ میں آپ سے بیعت کی اور آپ کو معہ اپنے ساتھیوں کے مدینے آنے کی دعوت دی۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ آپ کی ہر قیمت پر حفاظت کریں گے۔ اسلام کی سیاسی زندگی میں یہ بیعتِ عقبہ بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ یہاں سے سیاسی تنظیم کی ابتدا ہوئی اور اسی کے سبب سے مدینے کو ہجرت کی صورت بھی پیدا ہوگئی۔

ہجرت بیعت عقبہ کے بعد آنحضرت صلعم نے رفتہ رفتہ اپنے ساتھیوں کو مدینے بھیج دیا۔ کفارِ مکہ کو حالات کا پتہ چلا۔ انہوں نے ایک رات آپ کو قتل کرنے کی ایک گہری سازش کی۔ آپ کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے اپنے بستر پر حضرت علیؓ کو سلا دیا اور خود رات کی تاریکی میں دشمنوں کی آنکھوں میں خاک جھونک کر مکہ سے باہر نکل گئے۔ آپ کے ہمراہ حضرت ابوبکر صدیق رہنما تھے۔ کفار نے آپ کی تلاش شروع کی مگر آپ غار ثور میں چھپ گئے اور پھر موقع پاکر اڑتک راستہ سے مدینے کی جنوبی آبادی قبا پہنچ گئے۔ اس کی خبر مدینے والوں کو ہوئی تو وہ جوق در جوق ثنیۃ الوداع کی ٹیکری پر جمع ہوگئے۔ سب نے آپ کا پرجوش استقبال کیا،

اور بچوں نے دف بجا کر یہ گیت گایا۔

طَلَعَ الْبَدْرُ عَلَیْنَا مِنْ ثَنِیَّاتِ الْوَدَاعِ
وَجَبَ الشُّکْرُ عَلَیْنَا مَا دَعَا لِلّٰہِ دَاعٍ
اَیُّھَا الْمَبْعُوْثُ فِیْنَا جِئْتَ بِالْاَمْرِ الْمُطَاعِ

یعنی ثنیۃ الوداع سے چودھویں رات کا چاند ہم پر طلوع ہوا۔ ہم پر اس وقت تک شکر واجب ہے جب تک کوئی پکارنے والا خدا کی عبادت کرتا رہے۔ اے وہ جسے ہمارے لئے بھیجا گیا ہے۔ تو ایسی چیز لایا ہے جس کی اطاعت کی جائے گی!

جنگ کے آثار

بیعت عقبہ نے کفار مکہ کو پہلے ہی سے بے چین کر رکھا تھا۔ اس پر آنحضرت صلعم کا بچ کر نکل جانا جلتے پر تیل کا مصداق ہوا۔ قریش بہت جھنجلائے اور کوئی بات سمجھ میں نہیں آئی تو انہوں نے مہاجروں کی جائدادیں ضبط کر لیں۔ آپ کا وہ مکان بھی ضبط کیا گیا جو کہ حضرت خدیجہ رض سے آپ کو ورثہ ملا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ان غریب مسلمانوں پر جو کہ ہجرت نہیں کر سکتے تھے سخت مظالم ڈھائے جانے لگے اور انہیں سخت پریشان کیا جانے لگا تاکہ وہ اسلام ترک کر دیں کفار مکہ مدینہ والوں کے بھی دشمن ہو گئے اور اپنے بت پرستانہ نظام کے تحفظ کی فکر کرنے لگے۔ ان کے قدیم مذہب کو اس وقت مدینہ ہی کی طرف سے خطرہ لاحق تھا اور ان کے نزدیک مدینے کے مسلمانوں کا قلع قمع کیا جانا اس خطرہ کے سدباب کے لیے ضروری تھا۔ —— دوسری طرف آنحضرت صلعم کے سامنے ایک مقدس نصب العین تھا جس کی راہ میں سب سے بڑی مزاحمت قریش ہی کی تھی اور قرائن یہ بتا رہے تھے کہ اس مزاحمت کا استیصال قوت کے ذریعے نہیں کیا گیا تو نہ صرف اسلام کی تبلیغ میں ہرج واقع ہو گا بلکہ مدینے میں مسلمانوں کا وجود بھی معرض خطر میں پڑ جائے گا۔ —— ان حالات میں ایک اضطراری کیفیت پیدا ہوئی، فریقین کے دل میں مخالفت کا احساس شدید تر ہوتا گیا،

حربی کشمکش کے آثار نمودار ہوئے، اور آں حضرت صلعم کی دوربین نگاہوں کو مستقبل کی پیشانی پر جنگ کے گھناؤنے سائے نظر آنے لگے! اس لیے ایک معاملہ فہم سیاست داں

ایک دانشمند حکمران، اور ایک بلند حوصلہ سپہ سالار کی حیثیت سے آپ نے آنے والی مشکلات کے انسداد اور ہونے والی جنگوں میں مقابلہ کی تیاریاں شروع کر دیں۔

رسولِ عربی کی جنگی تیاریاں

جنگی تیاری کی اہمیت جنرل ٹوکر کہتا ہے کہ جنگ کی تیاری میدان جنگ سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ اس میں امورِ ذیل شامل ہیں۔

۱۔ اندرونی استحکام

۲۔ عوام کی اخلاقی تربیت

۳۔ ہمسایہ ممالک سے دوستانہ تعلقات

۴۔ نوعیت جنگ کا صحیح اندازہ اور اس کے لیے صحیح تربیت

۵۔ مادی وسائل کی فراہمی

۶۔ تیاری اسلحہ

۷۔ اسلحہ کے استعمال کی تعلیم

۸۔ منصوبۂ جنگ کی سادگی

۹۔ میدان جنگ کے نقشہ کی صحیح ترتیب

۱۰۔ خود کردہ اقدامات

۱۱۔ حکمت عملی اور تدبیر

۱۲۔ صحیح اشخاص کا انتخاب

۱۳۔ پروپیگنڈہ

جنگ سے پہلے اس امر کا اطمینان حاصل کیا جانا ضروری ہے کہ ملک کے باشندوں کو اپنی

حکومت پر کامل اعتماد ہے۔ اس اعتماد کے لیے ملک کی انتظامی مشینری اور میزان عدل کو نہایت مستحکم ہونا چاہیئے۔ ارباب حکومت کو اپنے شخصی کردار، خلوص اور دانشمندی کا ثبوت پیش کرنا چاہیئے۔ اور جس نصب العین کے لیے جنگ کی ضرورت ہو اس کے تقدس اور افادیت کا احساس عوام میں پیدا کرنا چاہیئے ـــــــ اندرونی استحکام کے ساتھ ساتھ ہمسایہ حکومتوں سے دوستی اور حمایت کا رشتہ بھی استوار ہونا ضروری ہے۔ عہد حاضر میں پروپیگنڈے کو بڑی اہمیت حاصل ہو گئی ہے۔ اس کے ذریعے اپنے عوام کے حوصلوں کو بلند، دنیا کی رائے عامہ کو ہموار اور دشمن کو مرعوب کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

جنگ کے نتائج پر عوام اور سپاہیوں کی اخلاقی حالت کا گہرا اثر پڑتا ہے۔ نپولین کہتا ہے کہ اخلاقی طاقت جسمانی طاقت سے کم از کم ـــــــــــــــ تین گنا زیادہ اہم ہے۔ اس لحاظ سے سچائی اور نفس کشی، ایثار اور قربانی کے اوصاف کو فتح و نصرت کے لیے لازمی شرائط قرار دیا گیا ہے ـــــــ دوسری جنگ عظیم میں ڈنکرک کے تخلیہ کے بعد جرمنوں کا سارے مغربی یورپ پر قبضہ ہو گیا اور انہوں نے انگلستان پر انتہائی خطرناک بمباری شروع کی جس کا سلسلہ برسوں جاری رہا۔ شہر برباد اور کارخانے نذر آتش ہو گئے، ذرائع حمل و نقل تباہ، بہت سے انسان ہلاک اور بے شمار مجروح ہو گئے۔ لیکن عوام کا عزم مستحکم اور حوصلہ بلند رہا۔ یہاں تک کہ حالات بدلتے گئے جرمنوں کی قوت گھٹتی گئی، اور بالآخر فتح انگریزوں کو نصیب ہو گئی ـــــــ اسی طرح سپاہیوں کی اخلاقی حالت بھی ان کی کارکردگی اور لڑائی کے نتیجہ پر اثر انداز ہوتی ہے۔ دوسری جنگ عظیم میں فرانس کی شکست کا ایک بڑا سبب اس کے سپاہیوں کی آرام طلبی ہی تھا۔ اسی طرح اٹلی کی ناکامی کا باعث بھی اطالوی سپاہیوں کی اخلاقی پستی ہی ہوتی ہے۔

فوج کا جدید ترین ہتھیاروں سے لیس ہونا بھی ضروری ہے۔ اس سے عوام کے اعتماد میں اضافہ ہوتا ہے اور غیر ممالک بھی احترام کرنے لگتے ہیں۔

ایک اچھا سپہ سالار ہر کام کے لیے موزوں ترین شخص کا انتخاب کرتا ہے۔ اقربا نوازی اور اعزا پروری کے مدنظر غلط شخص کے انتخاب سے نہ صرف منزل کی راہ میں دشواری ہی

پیدا ہوتی ہے۔ بلکہ عوام اور سپاہیوں میں بدمزگی اور بے چینی بھی اس کا لازمی نتیجہ ہوتی ہے ——— فوج میں اقربا پروری اور ناانصافی ملک و قوم کے ساتھ انتہائی خطرناک دشمنی کے مترادف ہے!

ہمسایہ ممالک سے اپنے تعلقات کو متعین کرنے کے لیے حسب ذیل امور کو ملحوظ رکھنا پڑتا ہے۔

۱۔ اپنے ملک کا جغرافیائی موقف

۲۔ اپنا قومی مفاد

۳۔ اپنی قوم کا عزم

پہلے دو امور ہمسایہ حکومتوں سے ہمارے تعلقات کو متعین کرتے ہیں اور تیسرے امر کے مطابق ہم اپنے لہجہ کا تعین کر سکتے ہیں۔

بوقت واحد غیر ضروری طور پر ایک سے زائد محاذوں کا قائم کرنا خطرناک ہوتا ہے ——— جرمنی نے دوسری جنگ عظیم میں ایسی ہی غلطی کی تھی۔ مغربی محاذ پر جنگ جاری تھی۔ انگلستان کا جزیرہ فتح نہیں ہو سکا تھا اور وہاں سے جوابی حملے برابر ہو رہے تھے کہ جرمنی نے مشرق میں روس کے خلاف جنگ چھیڑ کر ایک بہت بڑا محاذ قائم کر لیا۔ یہی غلطی بالآخر اس کی تباہی کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔

جنگ شروع کرنے سے پہلے اس امر کا بھی اندازہ کر لینا پڑتا ہے کہ لڑائی کن کن حالات اور کن کن اثرات کے تحت لڑی جائے گی، میدان جنگ کس قسم کا ہوگا، دشمن کے ہتھیاروں کا ہمارے پاس کیا جواب ہے، فریقین کے سپاہیوں میں لڑنے کی استعداد کتنی ہے اور ہم اپنے وسائل کے مدنظر اس جنگ کو کس طور پر اور کتنے عرصہ تک جاری رکھ سکتے ہیں۔

جو سپہ سالار ان تمام امور پر غور کر کے جنگ کا منصوبہ تیار کرتا ہے وہ بالعموم کامیاب ہوتا ہے۔ اور جو ان بنیادی امور کو نظر انداز کر دیتا ہے وہ بالآخر ناکام و نامراد ہو جاتا ہے ——— سکندر کی فتوحات، صلاح الدین ایوبی کی کامیابیاں، نپولین کی موری

اور ابدالی کی سربلندی ان کی دُور اندیشی، معاملہ فہمی اور موقع شناسی کی رہین منت ہے تو دارا کی ناکامی، صلیبیوں کی نامرادی، اور پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کی تباہی جنگ کے اہم تقاضوں سے لاپرواہی، خود غرضی، آرام طلبی اور اخلاقی پستی ہی کا نتیجہ ہے ـــــ!

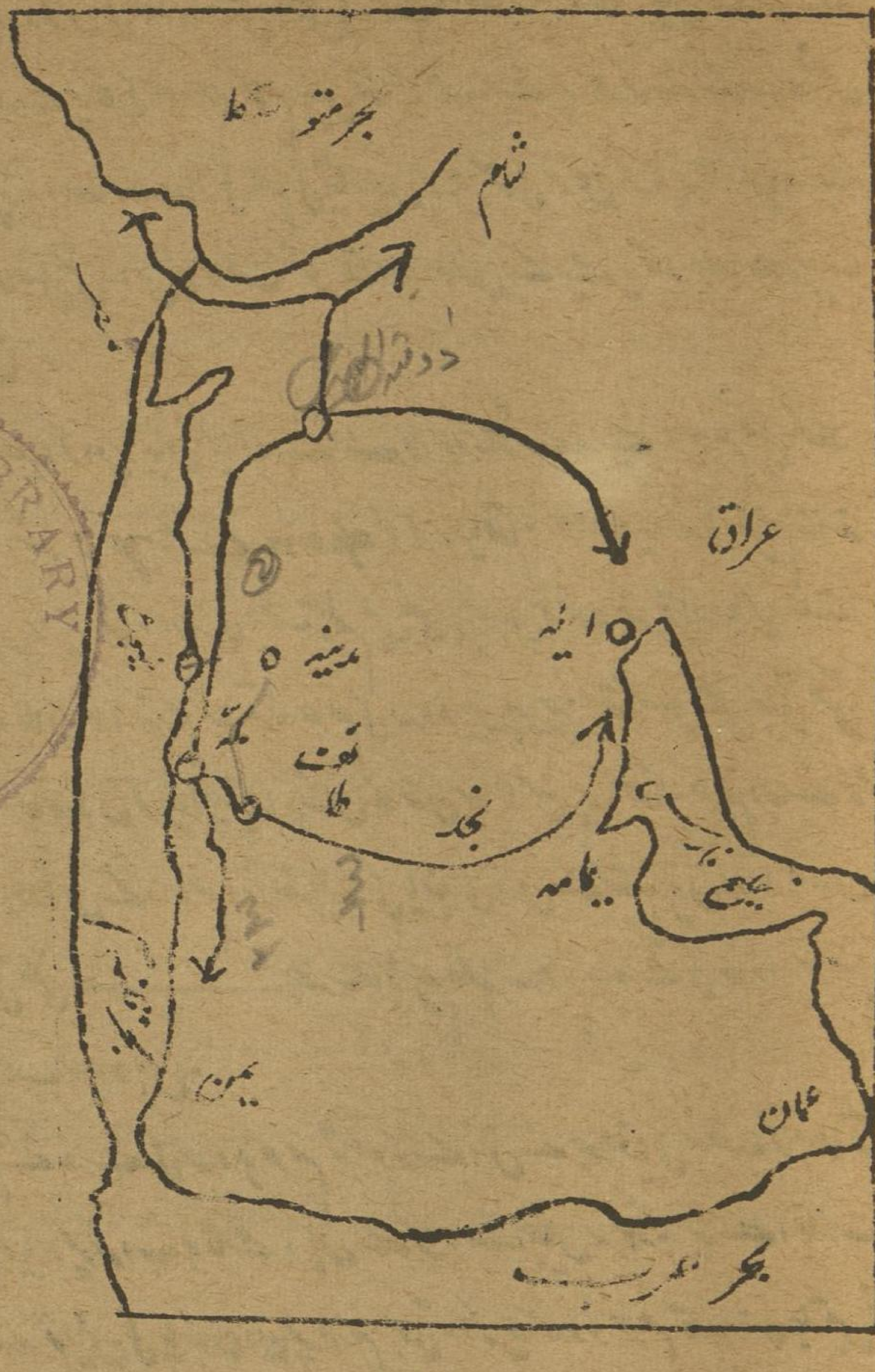
شہری مملکت

آنحضرت صلعم نے جنگی تیاری کے تمام اصولوں کو پیش نظر رکھا۔ اور مدینے پہنچنے کے بعد سب سے پہلے ایک شہری مملکت کی بنیاد قائم کر کے اُسے مستحکم کیا ــــ بے سروسامان اور بے خانماں مہاجرین کا مسئلہ اس مملکت کے لیے بہت نازک صورت اختیار کر سکتا تھا۔ لیکن آپؐ نے اسے نہایت خوش اسلوبی سے سلجھایا۔ مہاجرین اور انصار میں بھائی چارہ قائم کیا اور یہ طے فرمایا کہ جن میں یہ رشتہ قائم ہو وہ ایک دوسرے کے وارث بھی ہو سکیں گے۔ اس طریقۂ کار کی بدولت نہ صرف ایک اہم اقتصادی مسئلہ حل ہو گیا بلکہ مہاجرین و انصار میں محبت، یگانگت اور ہم آہنگی بھی پیدا ہو گئی۔۔۔!

اس کے ساتھ ہی آپؐ نے اپنے اور اپنے پیروؤں کے حقوق و فرائض کو ضبط تحریر میں لا کر ایک دستاویز کی شکل دی اور مدینے کے یہودی قبائل سے حربی اور سیاسی معاہدات کیے۔ جن کی رو سے انھوں نے آپؐ کو اپنا مشترک حاکم تسلیم کر لیا۔ ان تمام معاہدوں کو یک جا کر کے انہیں "صحیفہ" کا نام دیا گیا جو درحقیقت نہ صرف مدینے کا بلکہ تاریخ عالم کا پہلا تحریری دستور ہے۔ اس کی رو سے مدینے کو حرم اور شہری مملکت کا درجہ حاصل ہوا۔

مدینے کا محل وقوع

مندرجہ ذیل نقشہ سے واضح ہو گا کہ حجاز میں تجارت کے تین بڑے راستے تھے۔ شام، دومۃ الجندل اور عراق ایک راستہ سے مربوط تھے۔ دوسرا راستہ دومۃ الجندل سے ینبع، وہاں سے ساحل ساحل ہوتا ہوا مکے کو جاتا تھا۔ تیسرا راستہ مکے سے آگے ایک طرف عراق اور خلیج فارس اور دوسری طرف یمن تک چلا جاتا تھا۔ اہل مکہ انہی راستوں کے ذریعے تینوں بڑے براعظم ایشیا یورپ اور افریقہ سے تجارت کرتے تھے۔ ان شاہراہوں کے اطراف بدو آباد تھے جن کی آمدنی کا ذریعہ تجارتی قافلوں کی آمد و رفت تھا۔ ملک کا باقی حصہ بنجر ریگستان اور دشوار گزار تھا۔



لیکن مدینے کا علاقہ سرسبز و شاداب تھا۔ آب و ہوا اچھی تھی۔ اور تجارتی قافلے زیادہ تر اسی سمت سے گزرتے تھے کیونکہ ینبوع سے ساحل کا راستہ خطرناک اور دشوار گزار تھا۔ مصر سے آنے والے تاجر بھی مدینے ہی سے ہو کر مکّے جاتے تھے ـــــ مدینے میں کھانے پینے کی چیزوں کی بھی افراط تھی۔

اس صورت حال سے ظاہر ہے کہ جغرافیائی اور تجارتی اعتبار سے مدینے کو مکّے پر فوقیت حاصل تھی۔ مکہ والوں کے لیے مدینے کے باشندوں سے مخالفت مول لینا بہت مشکل امر تھا کیونکہ ایسی صورت میں ان کے تجارتی قافلوں کو ینبوع کا لمبا راستہ اختیار کرنا

پڑتا جہاں اشیائے خورد و نوش کی قلت اور حمل و نقل کی سخت دشواریاں موجود تھیں —— نیز مکے والوں کے لیے مدینے پر حملہ کرنا آسان کام نہیں تھا کیونکہ مدینے پر حملہ کرنے کے لیے انہیں سامان رسد ساتھ لانا پڑتا اور دور دراز کی مہم کی تیاریوں پر غیر معمولی خرچ کرنا پڑتا۔ گویا مدینے کو بڑی دفاعی اہمیت حاصل تھی۔ اس کا موقف مستحکم تھا اور مسلمانوں کے لیے یہ قلعہ بند علاقہ بہت مفید ثابت ہو سکتا تھا۔

حرم اور کعبہ

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے سرکارِ دو عالم نے مدینے کو حرم یعنی کھلا شہر (open city) قرار دیا تھا۔ حرم کا یہ اصول قدیم زمانہ سے مختلف ممالک میں رائج تھا۔ دوسری جنگ عظیم میں بھی پیرس کو کھلا شہر قرار دیا گیا تھا اور جرمنوں نے اس اعلان کا احترام کیا تھا۔ حرم کی حدود میں ہر چیز مقدس سمجھی جاتی تھی وہاں درخت کاٹنا، جانوروں کو ایذا پہنچانا، انسان کا خون بہانا منع ہوتا تھا۔ حرم بجائے خود ایک مملکت ہوتا تھا اور اس کے رسوم اور ضوابط کی پابندی اس کے شہریوں اور اجنبیوں پر بہر حال لازم ہوتی تھی —— حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مکے کی حدودِ حرم قائم کی تھیں جو ابھی تک موجود ہیں۔

پیغمبر اسلام نے مدینے کی حدودِ حرم قائم کر کے اس کے جغرافیائی موقف کو مسلمانوں کے لیے مفید تر بنا دیا۔ کیونکہ اب جو قافلے وہاں سے گزرتے انہیں سرکارِ مدینہ سے اجازت لینی پڑتی اور وہاں کے قوانین کی پابندی ان پر لازم ہوتی۔ اگر یہ حدودِ حرم قائم نہ کی جاتیں تو مکہ والوں سے جنگ کی صورت میں مدینہ کی حفاظت کے لیے بڑی فوج رکھنی پڑتی جس پر کافی خرچ آتا۔ نیز اس تدبیر سے مکے والوں کے لیے یہ بات ناممکن ہو گئی کہ مدینے پر چڑھائی کر کے حدودِ حرم میں شمشیر آزمائی کریں کیونکہ ایسی صورت میں خود مکے کی عافیت بھی برقرار نہیں رہ سکتی تھی اور مسلمانوں کے لیے حدودِ مکہ میں خونریزی کا جواز پیدا ہو سکتا تھا۔

ہجرت کے دوسرے سال سرکارِ دو عالم نے بیت المقدس کی بجائے کعبہ کو قبلہ مقرر کیا جس کا مقصد مسلمانوں کی منزل کو نشان زد کرنا اور ہجرت کی غرض کو واضح کر کے ان کی حربی کشمکش کے لیے ایک نصب العین کو متعین فرمانا تھا۔

اندرونی استحکام

قرآن مجید کی تعلیمات نے مسلمانوں کو اتحاد کی نعمت عطا کی۔ ذاتی عداوت دُور ہوئی، باہمی اعتماد قائم ہوا۔ تمدن و معاشرت کا معیار بدل گیا۔ قدروں میں انقلاب آگیا، خاندانی جھگڑے ختم ہوئے۔ اور تجارت کو فروغ ہونے لگا۔ — غلامانِ محمدی اخوت اور محبت کے جذبہ سے سرشار تھے، خدا کے طاقتور ہاتھوں نے انہیں ایک ہی زنجیر میں جکڑ دیا تھا اور محبت محمدی نے اُن کے قلوب کو ایک دوسرے کے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پیوست کر دیا تھا۔ خون اور قبیلے کے رشتے ٹوٹ چکے تھے اور واقعات سرعت کے ساتھ کفار سے جنگ اور تصادم کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اِن حالات میں سرکارِ مدینہ کو بعجلت ممکنہ جنگ کی تیاریوں کو مکمل اور حفاظتی انتظامات کو مستحکم کرنا تھا۔

خارجہ حکمت عملی

اندرونی استحکام کے بعد آپؐ نے امورِ خارجہ کی طرف توجہ مبذول فرمائی۔ آپؐ نے گرد و نواح کے قبائل میں تبلیغ شروع کی اور رفتہ رفتہ دُور افتادہ علاقوں کا بھی دورہ کیا۔ اپنے پیام کی خوبیوں کی وضاحت اور اپنے حُسنِ اخلاق سے بیرونی قبائل کو آپؐ نے اس طرح مسخر کیا کہ وہ آپ کے ہمدرد اور بہی خواہ ہو گئے۔ مدینے اور ینبوع کے درمیان بسنے والے قبیلے پہلے ہی سے انصار کے حلیف تھے۔ اب آپؐ نے اُن سے اپنے تعلقات کو مزید استوار کیا اور جنگی امداد کا بھی اُن سے عہد لے لیا۔[1]

آپؐ کی شخصیت اور جنگ کے اجزائے ترکیبی

عہدِ حاضر کے ماہرین جنگ اس امر پہ متفق ہیں کہ جنگ کے بنیادی اصول تعداد میں آٹھ ہیں جن پہ عمل کرنا فتح و نصرت کے لیے ضروری ہے لیکن تاریخِ جنگ

---

[1] سنہ ۲ھ میں جہینہ کے سرداروں سے حلیفی ہوئی۔ اور سنہ ۲ھ میں ینبوع کے آس پاس بسنے والے قبیلے بنو ضمرہ، بنو مدلج، بنو زرعہ اور بنو الربعہ سے دوستی اور غیر جانبداری کے معاہدے ہوئے۔

اس امر کا شاہد ہے کہ ان اصولوں پر سختی سے عمل کرنے کے باوجود بسا اوقات بڑی بڑی فوجوں کو ناکامی کا منھ دیکھنا پڑا ہے ـــــــــ دراصل جنگ کے مختلف اجزائے ترکیبی ہوتے ہیں اور جنگ کے اصول ان میں سے ایک جزو کا ایک پہلو ہیں جس طرح ایک رسّی کئی ریشوں سے بنتی ہے، اسی طرح جنگ بھی کئی عناصر سے مرکب ہوتی ہے۔ ریشے جس قدر مضبوط ہوں گے رسّی بھی اُسی مناسبت سے پائدار ہوگی۔ لیکن محض ایک ریشے کے کمزور پڑنے سے رسّی کمزور نہیں ہو سکتی بشرطیکہ دوسرے ریشے اپنی جگہ قائم ہوں۔ یہی حال جنگ کا بھی ہے۔ جنگ کے اصولوں پر سختی سے عمل کرنے کے مواقع حاصل نہ ہونے کے باوجود فتح حاصل ہو سکتی ہے۔ بشرطیکہ جنگ کے دوسرے تمام پہلو مستحکم اور استوار ہوں۔

جنگ کے چار اجزائے ترکیبی ہیں:-

۱۔ سپہ سالار کی شخصیت اور قابلیت

۲۔ سپاہیوں کی صلاحیت اور قابلیت

۳۔ اخلاقی حالت

۴۔ مادی وسائل

فیلڈ مارشل لارڈ ویول کے نزدیک سپہ سالار میں حسب ذیل اوصاف ہونا ضروری ہیں

۱۔ انسانیت کا علم اور اس سے دلچسپی

۲۔ فتح کا عزم مصمم

۳۔ حوصلہ مندی

۴۔ عقل سلیم

نپولین کی رائے میں شجاعت اور حوصلہ مندی کے بغیر کوئی شخص فوجوں کو نہیں لڑا سکتا۔ چنانچہ وہ کہتا ہے۔

"اگر فن جنگ خطرات کو مول نہ لینے میں مضمر ہو تو فتح و نصرت نہایت ہی گھٹیا درجہ کے انسان کا حصہ ہو سکتی ہے"

لفٹیننٹ جنرل برن کی رائے میں ایک اچھا سپہ سالار مندرجہ ذیل خوبیوں کا حامل

ہوتا ہے۔

(ا) اُس کی شخصیت سپاہیوں کے لیے منبعِ فیض ہوتی ہے۔

(ب) اپنی اور دشمن کی فوجوں کی صلاحیت اور حالات کے متعلق اُس کا علم وسیع ہوتا ہے۔ نیز دشمن کے سپہ سالار کے کردار کے بارے میں بھی وہ تمام ضروری معلومات حاصل کر لیتا ہے۔

(ج) اس میں منصوبہ بندی کی غیر معمولی صلاحیت ہوتی ہے۔ یہ منصوبہ بندی جنگی اصولوں کے مطابق وہ کرتا ہے ——— گویا کہ جنگ کے اصولوں سے واقفیت اور اُن کا نفاذ سپہ سالار کی شخصیت کا صرف ایک جزو ہے۔

عہدِ قدیم کے چینی جنرل سنتزو (Sun Tzu) کے خیال میں کسی اچھے سپہ سالار میں حسبِ ذیل خصوصیات ہوتی ہیں۔

(ا) برتر اور کمتر درجہ کی فوجوں کو لڑانے کے ہنر سے وہ واقف ہوتا ہے۔

(ب) اُسے دشمن کی طاقت کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔

(ج) مشکلات، خطرات، اور فاصلہ جات کا اُسے صحیح اندازہ ہوتا ہے۔

(د) شہرت کی قدروں سے وہ بالاتر ہوتا ہے۔

(ھ) سپاہیوں کی ذات سے اُسے اپنی اولاد کی طرح محبت ہوتی ہے۔

(و) نازک مواقع پر وہ شجاعت کے اعلیٰ ترین جوہر کا مظاہرہ کرتا ہے۔

سقراط کہتا ہے

"سالارِ لشکر کے لیئے یہ لازمی ہے کہ اُسے اس امر کا بخوبی علم اور اطمینان ہو کہ اس کی فوج کو سامان رسد کہاں سے ملے گا ——— نیز جنگی منصوبے تیار کرنے اور انہیں بروئے عمل لانے کی اُس میں استعداد ہونی چاہیئے۔ اُسے باریک بین، سادہ دل، محنتی، جفاکش اور کبھی رحمدل اور کبھی سفاک ہونا چاہیئے۔ کبھی چوکیدار کی طرح ہوشیار، کبھی چور کی طرح موقع کی گھات میں، کبھی فیاض، کبھی بخیل، کبھی بے باک، کبھی محتاط، کبھی متین و بردبار اور کبھی عیار و چالاک ۔۔۔ یہ ایسی خصوصیتیں ہیں جن میں سے بعض فطرتاً

ودلیعت کی جاتی ہیں۔ اِس کے علاوہ سپہ سالار کو فنِ حرب اور دفاعی سیاست کا ماہر ہونا بھی لازمی ہے"۔

سپہ سالار کی شخصیت جنگ کا محور ہوتی ہے۔ اس کی دانش مندی اُلجھے ہوئے معاملات کو سُلجھاتی ہے۔ اُس کی دور اندیشی آنے والے خطرات کا انسداد کرتی ہے۔ اور اس کی ثابت قدمی طوفاں کا رُخ پھیر دیتی ہے۔ وہ اگر انعام پسند ہو تو سپاہیوں کو میدانِ جنگ میں اپنے کمالات کے دکھانے کی ترغیب ہوتی ہے۔ وہ مردم شناس ہو تو ہر کام کے لیے موزوں شخص کا انتخاب ہو سکتا ہے۔ اور وہ اگر خدا ترس ہو تو سپاہی بھی دنیوی خوف و ہراس سے بالاتر ہو کر موت پر کمندیں پھینکنے لگتے ہیں۔ اُس کی بصیرت کامیابی کی ضمانت ہوتی ہے۔ اُس کی نگاہِ تیز دشمن کے ذہن و فکر کو چیر کر اُس کے ارادوں اور منصوبوں کو دیکھ لیتی ہے۔ اور اُس کے خلوص سے سپاہیوں کی رگ رگ میں بجلیاں رقص کرنے لگتی ہیں۔۔۔!

لیکن سپہ سالار کی ذراسی غفلت میدانِ جنگ کا نقشہ بدل دیتی ہے۔ اس کی ذراسی فروگذاشت پانسہ کو پلٹ دیتی ہے۔۔۔۔ اس کی ذراسی لاپرواہی بازی کو اُلٹ دیتی ہے۔ اس کے پائے استقلال میں ذراسی لغزش آئی اور سپاہیوں کے قدم میدانِ جنگ سے اُکھڑ گئے۔ اُس کے عزم میں تندرے تزلزل پیدا ہوا اور جیتا ہوا کھیل ہار دیا گیا۔ اور اُس کے ذہن میں معمولی سا انتشار آیا اور اُس کی فوجوں کا شیرازہ بکھر گیا! تاریخ جنگ ایسے عبرت آموز واقعات سے پٹی پڑی ہے کہ جہاں سپہ سالار کی ایک غلطی نے اُس کی باجبروت حکومت کو جبیں سائی پر مجبور کر دیا ہو، جہاں اس کی کمزوری نے اس کی قوم کے صدیوں کے وقار کو خاک میں ملا دیا ہو، اُس کی بزدلی نے اُس کی ملت کو گمنامی میں ڈال دیا ہو، اور اس کی اخلاقی پستی نے اس کے ملک کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑ دیا ہو۔۔۔!

واقعات سے ثابت ہے کہ رسولِ عربی کی ذاتِ گرامی میں ایک اعلیٰ ترین سپہ سالار کی بہترین خصوصیات جمع تھیں۔ قدرت نے آپ کو ذہانت اور تدبر کے بیش بہا خزانے عطا فرمائے تھے، اور زندگی کی صعوبتوں نے محنت و جفاکشی کے جوہر کو اور بھی اُجاگر کر دیا تھا۔۔۔ آپ کی خانگی زندگی، عادات و خصائل اعمال و افعال دنیا کے سامنے

تھے، اور اُن میں ایسی کشش اور خوبصورتی موجود تھی کہ نہ صرف آپ کے متبعین بلکہ مدینہ کے کفار و مشرکین بھی آپ کو قدر و منزلت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ عوام آپ کی دیانت کے معترف تھے، اور کفارِ مکہ آپ کی صداقت کے قائل تھے۔ چنانچہ ہجرت سے پہلے ایک روز ایک پہاڑی پر چڑھ کر آپ نے اہلِ مکہ کو آواز دے کر جمع کر لیا اور فرمایا

"اگر میں تم سے یہ کہوں کہ پہاڑی کی دوسری طرف دشمن کا ایک لشکرِ جرار مکہ پر حملہ کے لیے آ رہا ہے تو تم اس کو سچ سمجھو گے یا جھوٹ؟" ....

کفارِ مکہ نے جواب دیا کہ ہم اس کو سچ ہی سمجھیں گے کیونکہ آپ نے اپنی زندگی میں کبھی کوئی جھوٹ بات نہیں کی ہے۔ —— اسی طرح آپ کی انصاف پروری بھی ضرب المثل تھی خانۂ کعبہ کی جدید تعمیر کے سلسلہ میں حجرِ اسود کو اٹھانے کے مسئلہ پر مکہ کے سرداروں میں اختلاف پیدا ہوا تو آپ ہی کو ثالث مقرر کیا گیا۔ ہر سردار حجرِ اسود کے اٹھانے کے اعزاز کو اپنے لیے مختص سمجھتا تھا جس کے باعث اختلافات بڑھتے ہی جا رہے تھے اور تعطل کی سی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ لیکن آپ نے بحیثیت ثالث کمال تدبر سے اس گتھی کو سلجھایا۔ آپ نے ایک چادر پر حجرِ اسود کو اٹھا کر رکھ دیا اور پھر تمام سرداروں سے کہا کہ اس چادر کو پکڑ کر اس پتھر کو دوسری طرف منتقل کر دیں ......!

آپ کی خدا بینی و خدا ترسی، محنت اور جفاکشی، انسانی محبت اور ہمدردی کا ہر ایک کو اعتراف تھا۔ آپ کی نظر میں سب برابر تھے۔ گردن فرازوں پر غلاموں کو آپ نے قائد مقرر کیا تھا۔ سزا اور جزا میں کسی کے لیے کوئی امتیاز نہیں تھا۔ اور آپ کی نگاہوں کا فیض ہر شخص کے لیے یکساں طور پر جاری تھا .... یہی وجہ تھی کہ اہلِ ایمان آپ کی شخصیت کے گرویدہ ہو گئے تھے۔ ان کا جینا، اُن کا مرنا آپ کے حکم کی تعمیل کے لیے تھا، اور آپ کی اطاعت اُن کے لیے باعثِ فخر اور وجہِ نجات تھی ......!

آپ کے کردار کی تابناکی سے اہلِ یورپ کی نگاہیں بھی خیرہ ہو گئی ہیں۔ چنانچہ انگلستان کا مشہور پروفیسر کارلائل کہتا ہے

"ہم کسی طرح حضرت محمد کو حریص و منصوبہ باز اور اُن کی تعلیمات کو جہل و نادانی

نہیں سمجھ سکتے۔ وہ پیغام جو آپؐ لے کر آئے تھے بالکل سچا تھا۔ وہ ایک آواز پریشان تھی جو پردۂ غیب سے بلند ہوئی۔ اس شخص کے نہ اقوال جھوٹے تھے نہ افعال۔ اس میں تنگ ظرفی اور نمائش کا شائبہ تک نہ تھا۔ وہ زندگی کا ایک جلوۂ تاباں تھا جو خاص سینۂ فطرت سے ہویدا ہوا اور جسے خالقِ عالم نے کائنات کو منور کرنے کے لیے بھیجا تھا:

اور باسورتھ اسمتھ آپؐ کے بارے میں رقمطراز ہے کہ:

"یہاں پورے دن کی روشنی ہے جو ہر چیز پر پڑ رہی ہے اور ہر ایک تک وہ پہنچ سکتی ہے .... ہم محمدؐ کی بیرونی تاریخ کی ہر چیز کو جانتے ہیں ان کی جوانی، ان کا ظہور، ان کے تعلقات، ان کے عادات، ان کا پہلا تخیل اور تدریجی ارتقاء، ان کی عظیم الشان وحی کا نوبت نوبت آنا ...... ہم ایک کتاب (قرآن) رکھتے ہیں ... اس کی جوہری صداقت میں کوئی شخص سنجیدہ شک نہ کر سکا ..... اور ایک دماغ (محمدؐ عربی کا) جو اس روحانیت سے لبریز ہے جو اس کتاب کے اندر بند ہے ..... خدا کے نشہ میں مست و سرشار ......"

اور گبن کے الفاظ ہیں:

"کسی ابتدائی پیغمبر نے کبھی صداقت کا کوئی ایسا سخت امتحان پاس نہیں کیا جیسا کہ محمدؐ نے"

اور گاڈفری ہگنیس اپنی کتاب "اپالوجی فار محمدؐ" میں لکھتا ہے کہ:

"عیسائی اس کو یاد رکھیں تو اچھا ہو کہ محمدؐ کے پیغام نے وہ نشہ آپؐ کے پیروؤں میں پیدا کر دیا تھا جس کو عیسیٰؑ کے ابتدائی پیروؤں میں تلاش کرنا بے سود ہے ..... جب عیسیٰؑ کو سولی پر لے گئے تو ان کے پیرو بھاگ گئے ان کا نشہ دینی جاتا رہا، اور اپنے مقتدا کو موت کے پنجہ میں گرفتار چھوڑ کر چل دیئے ..... برعکس اس کے محمدؐ کے پیرو اپنے مظلوم پیغمبر کے گرد آئے

اور آپ کے بچاؤ میں اپنی جانیں خطرہ میں ڈال کر کل دشمنوں پر آپ کو غالب کر دیا...!! ؎

اے کہ در مدحت نہ تنہا دوستاں رطب اللساں
دشمناں ہم پیش پائے تو بہ سر انداختند!

آپ کی شخصیت سے عشق ان لوگوں کو تھا جو آپ کو ہر طرح اور ہر حیثیت سے جانتے تھے۔ اگر ان کی نگاہوں میں آپ کی شخصیت کامل نہ ہوتی تو وہ ہرگز ایسی عظیم الشان قربانیاں آپ کے لیے پیش نہ کرتے۔

مجاہدینِ اسلام کی اخلاقی تربیت

نپولین کے قول کے مطابق اخلاقی طاقت، جسمانی طاقت سے تین گنا زیادہ ہوتی ہے۔ اور لفٹیننٹ جنرل برن کہتا ہے کہ :-

"فوج کی اچھی اخلاقی حالت (Morale) میں ہر وہ چیز داخل ہے۔ جس کی بدولت فتح کا عزم مستحکم ہوتا ہو، اور معرکہ کارزار میں فوج کو ثابت قدمی نصیب ہوتی ہو"

اس کے نزدیک بہتر اخلاقی حالت میں حسبِ ذیل امور شامل ہوتے ہیں :-

۱۔ عزم و حوصلہ
۲۔ شجاعت و پامردی ـــ مقصد کے لیے موت پر کھیل جانے کی آرزو،
۳۔ بے نفسی و خود اعتمادی
۴۔ جفاکشی و ایثار
۵۔ اطاعت شعاری و فرمانبرداری
۶۔ ضبط و نظم
۷۔ اخوت اور مساوات
۸۔ انصاف کا احساس
۹۔ محبت اور ہمدردی

۱۰ - پاکیزہ طریقۂ فکر

۱۱ - اتحاد و ہم آہنگی

۱۲ - یقینِ محکم

اگر کسی فوج میں کردار کے یہ محاسن موجود نہ ہوں تو نتیجۂ جنگ کے متعلق ہم بہت آسانی سے رائے قائم کر سکتے ہیں ـــ سپاہیوں کا باہمی حسد اُن کے لیے زہرِ ہلاہل ہوتا ہے افسروں کی رقابت دشمن کے حملہ کو آسان کر دیتی ہے، بدنظمی تباہی کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ آرام طلبی فوج کی صلاحیت کو زنگ آلود کر دیتی ہے، اور عیش پسندی خودکشی کے مترادف ہو جاتی ہے۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ محض اخلاقی حالت کی خرابی کے سبب سے بڑی بڑی فوجیں نہایت ہی قلیل فوجوں کے ہاتھوں فنا کے گھاٹ اتر گئی ہیں اسلحہ کی برتری بے کار ثابت ہوئی ہے اور وسائل کی افراط رائیگاں چلی گئی ہے ...... گذشتہ جنگ عظیم میں فرانسیسیوں کی ناکامی کی ایک بڑی وجہ اُن کی آرام طلبی ہی تھی اور اطالویوں کی شکست اُن کے کردار کی پستی ہی کا نتیجہ تھی ـــــ پانی پت کے میدان میں ابدالی کے مٹھی بھر سپاہیوں کے مقابلہ میں تین لاکھ مرہٹہ فوج کی تباہی ایک طرف اُن کے سرداروں کی بداخلاقی، عاقبت نااندیشی، غرور اور تلوّن مزاجی کا نتیجہ تھی تو دوسری طرف افسروں کی باہمی رقابت اور سپاہیوں کی عیش کامی، بدنظمی، انتشار اور انشقاق بھی ان کی بربادی کا باعث ہوئے ہیں۔ یہی حال صلیبی جنگوں میں عیسائی افواج کا تھا جو اپنی ابتدائی شاندار کامیابیوں کے باوصف صلاح الدین ایوبی کے ہاتھوں اس طرح پس گئیں کہ پھر کبھی سر اُٹھانے کے قابل نہ رہیں۔

پیغمبرِ اسلام نے اس حقیقت کو ملحوظِ خاطر رکھا اور لشکریانِ اسلام کی اخلاقی تربیت اور ذہنی اصلاح پر اپنی خاص توجہ مرکوز فرمائی۔ آپؐ نے نیکی کا ایک بلند معیار قائم کیا اور حقوق اللہ اور حقوق العباد کا ایک پاکیزہ تصور اپنی اُمت کو دیا۔ روزہ رکھنے کا حکم دے کر سپاہیوں کا نہ صرف تزکیۂ نفس ہی کرنا چاہا بلکہ اس کے ذریعے بھوک پیاس اور تکالیف کا انہیں عادی بھی کر دیا۔ نماز سے یکسوئی خیال اور نظم و ضبط کا بھی سبق دیا اور اطاعت و فرمانبرداری کے جذبات بھی پیدا کیے۔ اور اس طرح مجاہدین کے درمیان مکمل ربط اور ہم آہنگی قائم

کر کے ایک ایسے لشکر کی تشکیل فرمائی جس کی نظیر تاریخ عالم میں نہیں مل سکتی ——— !

کسی سپہ سالار کی عظمت کا اندازہ اُس کے عساکر کی اخلاقی بلندی اور ذہنی تربیت سے بھی کیا جا سکتا ہے۔ اور رسولِ عربی کے کردار کا یہ پہلو ایسا روشن اور تابناک ہے کہ دنیا کی آنکھیں آج تک چکا چوند ہو رہی ہیں ——— آپ نے ایک نصب العین لشکریانِ اسلام کے سامنے رکھا اور اس کے لیے یقینِ محکم بھی پیدا کیا۔ اُن کے ہاتھ میں خدا کے پورے ہونیوالے وعدے کی دستاویز رکھ دی اور اُن کے قلوب کو اپنے فیضِ نظر سے ایسی قوت عطا کی کہ مقصدِ اعلیٰ کے لیے آگے ہی بڑھتے چلے گئے، طوفانوں سے دست و گریباں ہو گئے آندھیوں کے سامنے صف آرا ہو گئے، اور برق و باراں کی ہولناکیوں کو نظرِ حقارت سے دیکھنے لگے!

سپہ سالارِ اسلام اس حقیقت سے آشنا تھا کہ میدانِ جنگ میں تلوار کی چمک اور توپوں کی گرج سے زیادہ ایمان کی طاقت اور دل کی قوت کام آتی ہے!!

لیکن وہ مقصدِ اعلیٰ کیا تھا؟...... وہ نصب العین کیا تھا جو آپ نے لشکریانِ اسلام کے سامنے رکھا تھا؟ یہ مقصد، یہ نصب العین صرف اتنا تھا کہ خدا کی زمین کو فتنہ و فساد سے پاک کیا جائے! اللہ فتنہ و فساد کو ناپسند کرتا ہے، اُسے یہ گوارا نہیں کہ اس کے بندوں کو بے قصور ستایا جائے، نوعِ انسانی کے امن و چین کو معرضِ خطر میں ڈال دیا جائے، یا اولادِ آدم کی اخلاقی روحانی، اور مادی زندگی پر حملے کئے جائیں۔ اسی لیے وہ چاہتا ہے کہ مسلمان اس ظلم و طغیان کے انسداد اور عدل و انصاف کے قیام کے لیے زندگی کے عیش و آرام اور اپنی جان و مال کو قربان کرکے اُس کی محبت اور رضامندی کا استحقاق حاصل کریں!

نصب العین کی اسی رفعت کے مدنظر آپ نے جہاد کو بڑی اہمیت دی ہے۔ قرآن حکیم کے صفحات جہاد کی فضیلت سے بھرے پڑے ہیں۔ تبارک تعالیٰ فرماتا ہے کہ:-

"اے ایمان والو! کیا میں تمہیں ایسی تجارت بتاؤں جو تمہیں دردناک عذاب سے بچائے؟ وہ تجارت یہ ہے کہ تم اللہ اور اُس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اُس کی راہ میں اپنی جان اور مال سے جہاد کرو، یہ تمہارے لیے بہترین کام ہے اگر تم جانو" (الصف - ۲)

اور "جو لوگ ایمان لائے، جنہوں نے حق کی خاطر گھر بار چھوڑا اور اللہ کی راہ میں جان و مال سے لڑے، ان کا درجہ اللہ کے نزدیک سب سے بڑا ہے۔ اور وہی لوگ ہیں جو حقیقت میں کامیاب ہیں" (التوبہ - ۳)

اور وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ أَمْوَاتٌ بَلْ أَحْيَاءٌ ۔

یعنی جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوتے ہیں وہ مرتے نہیں بلکہ زندہ رہتے ہیں اور حیات جاوید حاصل کر لیتے ہیں!! ......

دل سے ایک بات نکلی اور دل پہ اثر کر گئی۔ قلندر کے دل کی دھڑکن یثرب کے رندوں کے سوزِ نفس میں جذب ہو گئی ...... آفتابِ رسالت کی تیز کرنوں نے صحرا نشینوں کے تخیل میں تموّج پیدا کیا۔ اسکندر مدینہ کے فیضِ نظر نے ان کی عقیدت میں تلاطم ڈال دیا، اور ریگستان حجاز پر عشقِ محمدی کا ایک طوفان امڈ آیا ...... محمد عربی نے اسرارِ مرگ و حیات کو فاش کیا، شہادت کے حسین چہرہ سے موت کے تاریک اور ہیبت ناک نقاب کو اٹھا دیا، اور جذبِ محمدی سوزِ عرب سے ٹکرا کر ساز بن گیا اور رگ ساز میں صاحبِ ساز کا لہو رواں ہو گیا!! اور یہی وہ ساز تھا جس کی لے پہ محمد کا سپاہی آگے بڑھ رہا تھا، چٹانوں سے ٹکرا رہا تھا، بلندیوں کو مغلوب اور موت پر فتح حاصل کرتا جا رہا تھا ......!!

سپاہی اور اس کی فوجی تربیت

ہمارا سپاہی ہمارے قومی وقار کا امین اور ہماری آزادی کا محافظ ہوتا ہے۔ یہ سرفروش ملت کی زندگی پر اپنی زندگی کو قربان اور مملکت کے مفاد پر اپنی متاعِ حیات کو نثار کر دیتا ہے۔ دراصل وہی میدانِ جنگ میں دفاعی منصوبہ کو نافذ کرتا ہے۔ اسپہ سالار کے لائحہ عمل کی تکمیل کرتا ہے، تلوار کی نوک سے قوم کے مستقبل کی تصویر کھینچتا، اپنے خلوص سے اُسے سنوارتا اور اپنے خون سے اُس میں رنگ بھر دیتا ہے۔ اس کے پسینے سے اس کی ملت کی آبیاری ہوتی ہے۔ اس کے آنسو قوم کی امیدوں کے چمن میں گلہائے رنگ رنگ کی تزئین کرتے ہیں اور اس کی ہڈیوں پر اس کی مملکت کی بنیادیں مستحکم ہوتی

ہیں !!

اس مقدس فرض کی انجام دہی کے لیئے سپاہی میں کردار کی بلندی اور سیرت کی پاکیزگی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے سامنے ایک بلند نصب العین ہونا چاہیئے۔ اور اس نصب العین سے اُسے بے پناہ محبت ہونی چاہیے ——!

بہترین سپاہی میں حسب ذیل اوصاف ہوتے ہیں۔

۱۔ اطاعت امیر کا جذبہ

۲۔ سپہ سالار پر کامل اعتماد

۳۔ سپہ سالار کی عظمت کا احساس

۴۔ نظم و ضبط (Discipline)

۵۔ ٹکنیکل حربی صلاحیت

۶۔ جسمانی صحت

۷۔ اسلحہ کے استعمال کی مہارت

۸۔ پھرتی اور مستعدی

۹۔ نقل و حرکت کی استعداد

۱۰۔ اپنے نصب العین کی عظمت کا احساس

آنحضرت صلعم کے فیض نظر سے یہ ساری خصوصیات مجاہدین اسلام میں پیدا ہو گئی تھیں۔ —— آپ نے اپنے سپاہیوں کو اسلحہ کا استعمال بتایا۔ سخت مزاحمت کے باوجود منزل مقصود تک پہنچنے کی صلاحیت اُن میں پیدا کی اور فوجی راز کی اہمیت کو اُن پر واضح کیا۔ نیز اپنی فوجوں کے لیے علم مخصوص کر کے حربی برتری کا اعلان کر دیا۔

آپ نے فوجوں کی صف بندی کو اہمیت دی۔ معرکہ کارزار میں آپ خود ہاتھ میں چھڑی لیئے ہوئے صفوں کو استوار کرتے تھے اور بہ نفس نفیس تمام دستوں کا معائنہ فرماتے تھے۔

جاسوسی کا بھی آپ نے مکمل انتظام کر لیا تھا۔ مکہ میں خفیہ نگار مقرر تھے اور فوجی دستے بھی اس غرض کے لیے متعین کر دیئے گئے تھے۔

حرکت پذیری

جنگ میں کامیابی کے لیے یہ امر بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ فوجیں جنگی علاقہ کے جغرافیہ سے واقف ہوں، اور اُن میں نقل و حرکت کی بہترین صلاحیت بھی موجود ہو ——— جنگ کی تاریخ فی الحقیقت قوتِ نقل و حرکت کی تاریخ ہے اور قوت نقل و حرکت کی تاریخ متحرک فوجوں کی تاریخ ہے۔ انیسویں صدی تک یہ فوجیں سواروں پر مشتمل ہوتی تھیں۔ لیکن آج مشینوں نے گھوڑوں کی جگہ لے لی ہے۔ سکندر اعظم نے پہلی مرتبہ سواروں کو پوری طرح منظم کیا اور انہی کی بدولت اُس نے وسیع علاقے فتح کئے اس کے سواروں نے گاگیملا (Gaugamela) اور ہڈاسپیس کے میدانوں میں تاریخ جنگ پر اپنی اہمیت اور افادیت کی مہر لگا دی ہے ۲۱۶ ق م میں کینی (Cannae) کے میدان میں ہنی بال کو اپنے سواروں ہی کی برتری کے سبب سے شاندار کامیابیاں نصیب ہوئی تھیں۔ اسی طرح ۵۳ ق م میں رومی جنرل کریسس (Crassus) کو پارتھین سواروں نے شہر کیریا (Carrhae) کے قریب تباہ کر دیا تھا۔۔۔۔

نقل و حرکت کی جنگ کی تاریخ میں چنگیز خاں کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ اس کی فوج تیر انداز سواروں پر مشتمل ہوتی تھی۔ ہر سوار کے پاس تین فاضل گھوڑے ہوتے تھے ایک پر وہ سوار ہوتا، دوسری مادہ ہوتی جس سے وہ دودھ حاصل کرتا اور تیسرے و چوتھے کو وہ بوقت ضرورت غذا کے طور پر استعمال کرتا ——— چنگیز خاں کی یہی قوت تھی جس کی وجہ سے بحر جاپان سے بالٹک تک کے علاقہ کو اس نے روند ڈالا تھا ——— اسی طرح تیمور کی کامیابیوں کا سہرا بھی اس کے سواروں ہی کے سر ہے۔ اور لیپزگ، اور واٹرلو کے میدانوں میں نپولین کی شکست کا ایک بڑا سبب بھی یہی تھا کہ اُس کی بھاری فوجوں میں نقل و حرکت کی صلاحیت کم ہو گئی تھی!

سنہ ۱۹۱۴ء کی پہلی جنگ عظیم میں متحرک دستوں کی سخت کمی تھی۔ اسی وجہ سے دفاعی خطوط پر فریقین کی بھاری فوجیں برسوں پڑی رہیں جن کے لیے حمل و نقل کے ذرائع بہت محدود تھے۔ بھاری اسلحہ کی نقل و حرکت بھی گھوڑوں ہی سے ہوتی تھی اور سپاہیوں کے لانے لے جانے کے لیے بھی تیز رفتار وسائل موجود نہیں تھے۔۔۔ لیکن اس جنگ کے آخری زمانہ میں مشینوں کا استعمال ہونے لگا، ہوائی جہازوں سے بمباری شروع ہوئی اور

متحرک دستے تیزی سے آگے اور پیچھے حرکت کرنے لگے ـــــ اور نتیجتاً یہ طویل حربی سلسلہ اختتام کو پہنچ گیا۔

آنحضرت صلعم کو فوجوں کی حرکت پذیری کی اہمیت کا صحیح اندازہ تھا۔ اور اسی سبب سے آپ نے اس کی طرف زیادہ سے زیادہ توجہ مبذول فرمائی تھی۔ اوائل جوانی میں جب کہ آپ تجارتی قافلوں کے ساتھ سفر کرتے تھے حجاز کے علاقوں میں گھومنے کا آپ کو اتفاق ہوا تھا جس کی بدولت آپ اس کے جغرافیائی حالات سے بخوبی واقف ہو گئے تھے۔ مدینہ کے انتخاب میں آپ کی یہی واقفیت غالباً ایک اہم محرک تھی ـــــ آپ نے مدینے سے ینبوع اور ینبوع سے مکہ تک اپنی فوجوں کا دورہ کرایا تاکہ وہ تمام مشکل راستوں اور زمین کے نشیب و فراز سے آگاہ ہو جائیں۔

آپ نے پہلے گردونواح کے قبائل کا دورہ کیا۔ سب سے پہلے ودان تشریف لے گئے جو مکہ کے راستہ میں ہے۔ اس قبیلہ سے جنگ کی صورت میں غیر جانبداری کا عہد لے کر مدینہ لوٹ آئے۔

مدینے پہنچ کر عبیدہ بن حارث اور سعد بن ابی وقاص کی سرکردگی میں دو علیحدہ علیحدہ لشکر روانہ کئے پہلے دستے کا سامنا قریش کے لشکر سے ہوا لیکن لڑائی نہیں ہو سکی۔ دوسرا دستہ خرار تک جاکر لوٹ آیا۔ ایک اور دستہ حمزہ بن عبدالمطلب کے تحت سیف البحر کی طرف روانہ کیا گیا۔ ساحل پر اس کا سامنا مکہ کے ابوجہل بن ہشام سے ہوا۔ مگر کوئی جھڑپ نہیں ہو سکی۔

اعصابی جنگ

اس نقل و حرکت سے قریش کے قافلوں میں ہیبت پیدا ہو رہی تھی اور وہ اپنی حفاظت کے لیئے بڑے انتظامات کر رہے تھے۔ اسی سلسلہ میں آنحضرت صلعم بہ نفس نفیس ایک بڑا لشکر لے کر کوہ رضوی سے گزرتے ہوئے الابواط پہنچے اور بغیر کسی جنگ کے لوٹ آئے۔ کچھ روز بعد پھر ایک لشکر کے ساتھ ذات الساق تک چلے گئے۔ وہاں سے دشوار گزار راستوں سے ہوتے ہوئے ذوالعشیرہ پہنچے جہاں بنی مدلج اور بنی حمزہ سے غیر جانبداری کا معاہدہ کر کے مدینے مراجعت فرما ہوئے۔

کچھ عرصہ بعد عبداللہ بن جحش کو ایک دستہ کے ساتھ نخلہ روانہ کیا گیا تاکہ قریش کے حالات معلوم کئے جا سکیں۔ وہاں پہنچنے پر مسلمانوں کو قریش کا ایک قافلہ نظر آیا جو طائف کے میوے لے جا رہا تھا۔ عبداللہ بن جحش نے اس قافلہ کو لوٹ لیا اور اس کے سردار کو ہلاک کر دیا کیونکہ کچھ روز پہلے قریش کا ایک شخص مدینے کے مویشی چرا کر لے گیا تھا۔ ــــــــــ جب وہ مدینہ واپس ہوا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بلا اجازت خونریزی پر اُس سے باز پرس کی۔ آپ نے قریشی سردار کا خون بہا اپنی طرف سے ادا کیا۔ اور اُن دو اسیروں کو بھی رہا کر دیا جنہیں عبداللہ گرفتار کر کے لایا تھا۔

سپہ سالار اسلام کا تدبر

ہر دانش مند سپہ سالار اس امر کی سعی کرتا ہے کہ ایسے مقام پر مقابلہ کے لیئے دشمن کو مجبور کیا جائے جو اُس کے لئے سہولت کا باعث اور اُس کے دشمن کے لیئے دشواریوں کا موجب ہو۔ ــــــــــ

سرکارِ مدینہ نے فوجی نقل و حرکت کے ذریعے ایسی تدبیریں اختیار کیں جن سے اہلِ مکہ کی تجارت کو سخت نقصان پہنچتا تھا۔ انتہا قریش نے اس خطرے سے بچنے کے لیئے دُور دراز کے راستے اختیار کئے لیکن راستوں کی طوالت کی وجہ سے اُن کے منافع کی مقدار گھٹتی گئی اور ان راستوں پر سامان خوراک دستیاب نہ ہونے کے باعث انہیں بڑی پریشانیوں کا سامنا ہونے لگا ــــــــــ نتیجتاً انہوں نے جنگ کے ذریعے اس صورت حال کا فیصلہ کرنا اور تلوار کے زور سے اپنا راستہ بنانا چاہا۔ لیکن ان راستوں پر مدینے والوں کو قابو حاصل تھا۔ اس لیے قریش ایسے مقامات پر جنگ کے لیے مجبور ہو گئے جو فنِ حرب کے اعتبار سے مدینے کی فوجوں کے لیے تو مفید تھے لیکن خود اُن کے لیے سخت تکلیف دہ اور مضرت رساں ثابت ہوئے۔!

جنگ بدر

اسباب جنگِ بدر کے اسباب مذہبی، سیاسی، اور معاشی تھے جن کا اجمال درج ذیل ہے۔

۱۔ اسلام کی روز افزوں ترقی سے قریش کے بت پرستانہ نظام کو خطرہ تھا۔

۲۔ قریش مسلمانوں پر بے انتہا مظالم توڑ رہے تھے۔ اور انہیں سخت عقوبتیں پہنچا کر ترک اسلام یا جلاوطنی پر مجبور کر رہے تھے۔

۳۔ جو مسلمان ہجرت کرکے مکے سے جا رہے تھے اُن کی جائداد یں ضبط کی جا رہی تھیں۔

۴۔ مسلمانوں کے نئے مسکن یعنی حبشہ اور مدینہ کے حکمرانوں اور با اثر لوگوں کو قریش ترغیب دے رہے تھے کہ تارکین وطن کو پناہ نہ دی جائے۔

۵۔ ان ناانصافیوں کے انتقام کے لیئے مدینے کے مسلمان قریش پر معاشی دباؤ ڈال رہے تھے۔ قریشی قافلوں کی آمدورفت کو یثرب کے علاقہ میں روک دیا جا رہا تھا۔ اور ان کے لوٹے جانے کا ہر وقت اندیشہ لاحق تھا۔ دور دراز کے راستے اختیار کرنے میں قریش کا نقصان ہو رہا تھا۔ اور ان راستوں میں رسد اور غذا کی قلت کے سبب سے شدید دشواریوں کا انہیں سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔

۶۔ عبداللہ بن جحش نے قریش کے تجارتی قافلہ کو نخلہ میں لوٹ لیا تھا اور اُس کے سالار کو ہلاک کر دیا تھا۔ اہل مکہ نے اس واقعہ کو اپنی توہین قرار دیا تھا۔

بدر کا محلِ وقوع

عرب کا مغربی علاقہ پہاڑی ہے۔ اس لیے وادیوں ہی سے قافلے والے گزرتے ہیں۔ گھاٹیوں کا راستہ زیادہ دشوار گزار ہے۔ عہدِ قدیم اور عہدِ نبوی میں جو راستہ مکہ، بدر، اور مدینہ سے گزرتا تھا اُس میں تبدیلی ہوگئی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام کے آنے کے بعد رفتہ رفتہ حاجیوں کی تعداد جب لاکھوں پہ پہنچی تو پانی اور پڑاؤ کی ضرورتوں کے مدِنظر بعض منزلوں کو بدل دیا گیا، ترکوں نے اپنے عہدِ حکومت میں ایک علیحدہ راستہ "طریق سلطانیہ" بنایا تھا جس کے کچھ حصّہ پر ریلوے لائن بھی بچھادی گئی تھی۔

بدر اور مدینے کے درمیان متعدد نخلستان موجود ہیں۔ حمرا سے مدینے تک جنگل بھی پائے جاتے ہیں۔ جگہ جگہ میٹھا پانی ملتا ہے اور علاقہ سرسبز ہے۔ چراگاہیں بھی موجود ہیں

بدر ایک بیضوی شکل کا میدان ہے جو چاروں طرف سے پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے۔ اس میدان کی لمبائی تقریباً پانچ میل اور چوڑائی چار میل ہے۔ یہاں سے بحرِ احمر تقریباً دس میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ اس کے ساحل سے بھی قافلہ کا راستہ گزرتا ہے۔ بدر کا میدان زیادہ تر ریتلا ہے۔ مکہ، شام اور مدینہ جانیوالے راستے جو وادیوں سے گزرتے ہیں بدر ہی میں ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔

آنحضرت صلعم کی بدر کو روانگی

ابوسفیان بن حرب کی سرکردگی میں قریش کا ایک تجارتی قافلہ شام سے مکہ کی طرف جارہا تھا۔ اس قافلہ میں ایک ہزار اونٹ تھے جن پر تقریباً پانچ لاکھ درہم کا اسباب لدا ہوا تھا۔ آنحضرت صلعم اس کو روکنے کے لیے بتاریخ ۱۲ رمضان المبارک سنہ ۲ھ تین سو تیرہ مسلمانوں کا ایک لشکر لے کر بدر کی سمت میں روانہ ہوئے کیونکہ مدینے اور مکے کے راستوں کا قریب ترین اتصال اسی مقام پر ہوتا تھا۔

آپؐ نے کچھ اشخاص کو آگے روانہ کیا تاکہ قریشی قافلہ کی اطلاعات حاصل کی جائیں۔ اور اُن کے پیچھے لشکرِ اسلام کو لیے ہوئے آپؐ آگے بڑھتے چلے گئے۔ یہ لشکر ابوسفیان کے قافلے سے چند گھنٹے قبل بدر پہنچا۔ اس تاخیر کی ایک وجہ غیر معروف

راستوں سے چکر لگا کر مسافت طے کرتا تھا۔ اور دوسری وجہ یہ تھی کہ قریشی قافلہ کی نقل و حرکت کی اطلاع دیر سے پہنچی تھی۔ دوسری طرف ابوسفیان کو نخلہ کے معرکہ کا حال معلوم تھا اور خود اس کے قافلہ کا تعاقب مسلمانوں نے ایک مرتبہ کیا تھا —— چنانچہ بدر پہنچنے سے پہلے الحنین کے موڑ پر قافلہ رُک گیا اور ابوسفیان صورت حال کی دریافت کے لیے آگے نکلا۔ چند بدوؤں نے اُسے آنحضرت صلعم کی سانڈنی سواروں کا پتہ دیا اور اُس نے اُن کی مینگنیاں توڑ کر دیکھیں تو اُن میں کھجور کی گٹھلیاں برآمد ہوئیں۔ ابوسفیان کو یقین ہوگیا کہ یہ سانڈنیاں مدینے سے آئی ہیں کیونکہ صرف مدینے ہی کے لوگ اپنے اونٹوں کو ایسا چارہ دے سکتے ہیں —— بہرحال وہ بہت پریشان ہوا اور حالتِ اضطرار میں اپنے قافلہ میں پہنچا اور ایک طرف امدادی دستوں کے لیئے تیز رفتار سوار مکّے کو روانہ کیئے اور دوسری طرف خود بدر کا راستہ چھوڑتے ہوئے ساحل کے راستے نہایت تیزی سے آگے نکل گیا اور دن رات مسافت طے کر کے مکے پہنچ گیا۔

ابوجہل کے لشکر کی بدر پر چڑھائی

ابوسفیان کے پیام سے مکے میں کھلبلی پڑ گئی اور ابوجہل نے جلدی سے قریش کے ایک ہزار رضاکار جمع کر کے بدر کا رُخ کیا۔ ابوسفیان نے مکے پہنچ کر ابوجہل کے پاس قاصد بھیجا کہ قافلہ کو خطرہ سے بچا لیا گیا ہے اس لیئے آگے بڑھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن ابوجہل نے بات نہیں مانی اور جواب دیا کہ ہم لوگ بدر میں کچھ روز قیام کر کے لوٹیں گے تاکہ وہاں کا میلہ بھی دیکھ سکیں اور بت خانہ پر نذر بھی چڑھا سکیں —— ابوجہل کے سپاہیوں نے بدر پہنچ کر عنقل کے ٹیلے کے پیچھے اپنے خیمے نصب کر دیئے۔ رات میں بارش ہوئی جس کی وجہ سے وادی میں کیچڑ ہو گیا اور یہ سپاہی آگے بڑھ کر پانی کے چشمے پر قبضہ کرنے سے قاصر رہے۔ دوسرے روز دلدل سے نکل کر وہ آگے بڑھے۔ انہیں ایک مسطح زمین نظر آئی جو دراصل ریتیلی تھی لیکن بارش کے سبب سے مسطح ہو گئی تھی۔ قریش اس کو سمجھ نہیں سکے اور وہیں اپنا پڑاؤ ڈال کر ٹھہر گئے۔

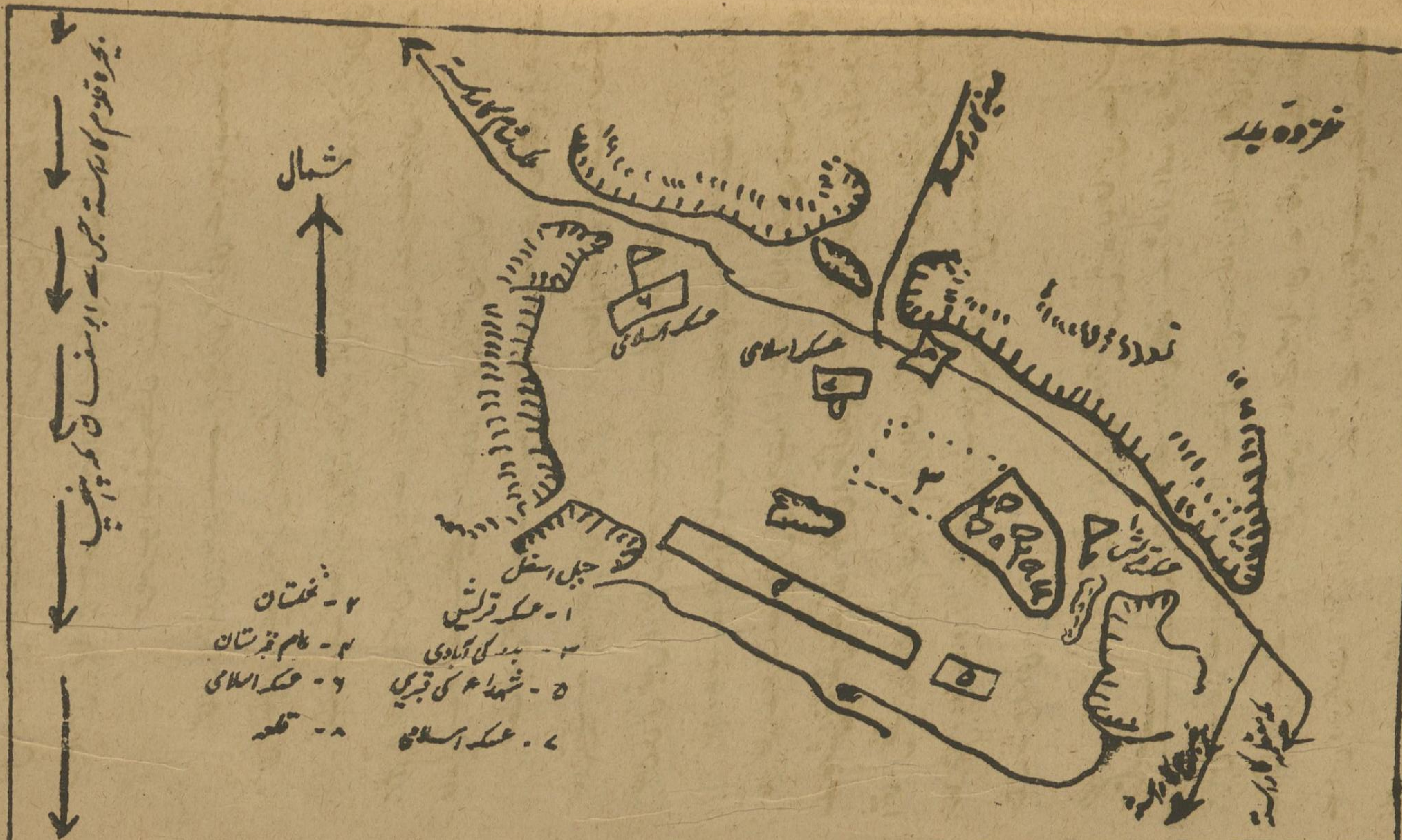
ابوجہل کے لشکر کو بدر پہنچنے تک ایک ہفتہ لگ گیا ہوگا۔ آنحضرت صلعم اس عرصہ میں

مدینے مراجعت فرما سکتے تھے۔ لیکن آپؐ غالباً اس وجہ سے وہیں ٹھہرے رہے کہ اس علاقے کے تمام قبائل سے دوستی اور غیر جانبداری کے معاہدے ہو چکے تھے۔

صف بندی

ابو جہل کے لشکر کی آمد کی خبر سردار مدینہ کو پہنچی تو آپؐ نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کر کے اُس کے مقابلہ کا فیصلہ کیا۔ یہ طے کیا گیا کہ مکے کی سمت سے آنے والے حملہ آوروں کے مقابلہ کے لیے پڑاؤ کو بدل دیا جائے۔ اور پانی کے چشمے پر پوری طرح قبضہ کر لیا جائے۔ اس امر کو بھی ملحوظ رکھا گیا کہ جنگ کے دوران میں سورج کی شعاعوں سے مسلمان سپاہیوں کی آنکھیں خیرہ نہ ہو سکیں ــــــ اس منصوبہ کے مطابق آگے بڑھ کر پانی کے چشمہ پر قبضہ کر لیا گیا تاکہ قریش اس سے محروم ہو جائیں اسی چشمہ کے قریب مسلمانوں کا پڑاؤ ڈال دیا گیا اور آنحضرت صلعم کے لیے ایک عریش یا جھونپڑی متصلہ ٹیلے پر بنا دی گئی تاکہ آپؐ وہاں سے میدان جنگ کو بچشم خود دیکھ سکیں۔ اس جگہ آگے چل کر ایک مسجد تعمیر ہوئی ہے جسے مسجد عریش کہا جاتا ہے۔

تین سو تیرہ مسلمان دشمن کے تقریباً ایک ہزار سپاہیوں سے لڑنے کے لیے تیار ہو گئے۔ لڑائی سے پہلے کی رات مجاہدین کو دستوں اور صفوں میں تقسیم کیا گیا۔ آنحضرت صلعم ایک چھڑی ہاتھ میں لے کر میدان میں نکل آئے۔ صفوں کو استوار کیا میمنہ اور میسرہ پر افسروں کو متعین فرمایا، ساری فوج کی تین جماعتیں بنائیں اور ہر ایک کو علحدہ علیحدہ علم عطا کیا۔ آپؐ نے صفوں کو استوار رکھنے کی تاکید کی۔ اور ہدایت فرمائی کہ دوران جنگ میں احکام کی سختی سے تعمیل کی جائے۔ آپ نے حکم دیا کہ تیر صرف اس وقت چلائے جائیں جب دشمن زد میں آ جائے۔ اس پر بھی دشمن آگے بڑھے تو اس پر سنگباری کی جائے۔ اور قریب تر آنے کی صورت میں نیزوں سے اور پھر تلواروں سے مقابلہ کیا جائے مسلمان سپاہیوں نے اپنے پاس پتھر کے ڈھیر لگا لیے ــــــ لیکن دشمن کو یہ سہولت حاصل نہیں تھی کیونکہ وہ اقدام کر کے آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ مسلمانوں کے پاس کوئی یونیفارم نہیں تھا اس لیے انہوں نے باہمی شناخت کے لیے "یا منصور امت" اپنا شعار مقرر کیا سپہ سالار اسلام نے حکم دیا کہ " اذا قتلتم فاحسنوا القتلة " (یعنی تم جب


غزوہ بدر
شمال
عسکر قریش
عسکر اسلامی
جبل اسفل
١ - عسکر قریش
٢ - نخلستان
٣ - بدر کی آبادی
٤ - عام قبرستان
٥ - شہداء کی قبریں
٦ - عسکر اسلامی
٧ - عسکر اسلامی
٨ - قلعہ

قتل کرو تو اچھی طرح سے قتل کرو۔ نیز ضعیفوں، کمزوروں، زخمیوں، عورتوں، بچوں اور غیر محاربین پر ہتھیار چلانے کی ممانعت کی ایک آیت بھی اسی وقت نازل ہوئی کہ

وَاضْرِبُوا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ،

یعنی ان کی جوڑوں پر مارو ـــــ غیر ضروری خونریزی سے اجتناب کے ساتھ ساتھ دشمن کو ناقابل کر دینے کی یہ بہترین صورت تھی۔

آپ نے ایک محفوظ دستہ بھی علیحدہ رکھا تاکہ نازک وقت پہ کام آسکے۔ نیز زخمیوں کی مرہم پٹی کرنے، سپاہیوں کو پانی پلانے اور میدان جنگ میں گرے ہوئے تیروں کو جمع کرکے مجاہدین کے حوالے کرنے کیلئے عورتوں کی جماعتیں بھی متعین فرمائیں۔

صف بندی مکمل کرنے کے بعد آپ اپنے چند صحابہ کے ساتھ اس ٹیلے پہ چڑھ گئے جہاں آپ کے لیے جھونپڑی بنائی گئی تھی، اطلاع رسانی کے لیے تیز رفتار سانڈنیاں متعین کی گئی تھیں اور وہاں سے مدینے کا راستہ کھلا رکھا گیا تھا۔

سردار مدینہ نے اعصابی جنگ کے ذریعہ پہلے ہی سے دشمن کو ہیبت زدہ کر رکھا تھا۔ نخلہ کے معرکہ نے مسلمانوں کی شجاعت کو ثابت کر دیا تھا اور میدان جنگ میں مجاہدین کے جوش و خروش سے کفار کا دل دھڑک رہا تھا۔ چنانچہ لشکر کفار کے سربرآوردہ اشخاص عتبہ بن ربیعہ، حکیم بن حزام اور مروان بن حکم نے کوشش کی کہ بغیر کسی جنگ کے معاملہ ختم ہو جائے اور قریش اپنے گھر لوٹ جائیں۔ لیکن ابوجہل نے ایک نہ سنی اور فوراً جنگ شروع کر دی۔

جنگ ابوجہل نے اپنی فوج کو دو حصوں میں تقسیم کیا تھا جن کے پاس تین جھنڈے تھے۔ دونوں حصے آگے بڑھ کر ایک جگہ ٹھہر گئے ابوجہل نے لشکر سے باہر آکر اس زمانہ کے جنگی رواج کے مطابق مبارزت طلبی کی، اس نے عتبہ، اس کے بیٹے ولید اور بھائی شیبہ کو سامنے بھیجا۔ ان کے مقابلہ کے لیے انصار کے تین جوان عوف، معوذ، اور عبداللہ آگے بڑھے۔ لیکن ابوجہل نے ان سے لڑنے سے انکار کر دیا اور کہلا بھیجا کہ ہمارے جوان صرف قریش ہی سے لڑ سکتے ہیں۔ اس پر حمزہ بن

عبدالمطلب، عبیداللہ بن الحارث اور علیؓ ابن ابی طالب اپنے لشکر سے نکلے۔ مقابلہ میں تینوں مشرک ہلاک ہو گئے مسلمانوں میں سے عبیداللہ سخت زخمی ہوئے جنہیں لشکر میں لایا گیا مگر وہ جانبر نہ ہو سکے۔

اس صورت حال کو دیکھ کر لشکر کفار نے ایک دم ہلہ بول دیا۔ اور تیزی سے آگے بڑھتا گیا۔ آنحضرت صلعم نے اس لشکر کو کافی دور تک آگے بڑھنے دیا اور جب پوری طرح وہ زد میں آ گیا تو تیر اندازوں کو حکم دیا جنھوں نے نہایت تیزی سے تیروں کی خوفناک بوچھاڑ شروع کر دی ——— آپؐ نے آسمان کی طرف دیکھا پھر مٹھی بھر خاک دشمن کی طرف پھینکی تھوڑی ہی دیر میں تیز ہوا چلنے لگی جس کے سبب سے ریت کا طوفان کفار کے کیمپ کی طرف بڑھا اور وہاں ابتری پھیل گئی۔ اس کے ساتھ ہی آپؐ نے اقدام کرنے والے دستے کو جس میں حضرت علیؓ اور حضرت حمزہؓ جیسے جانباز مجاہد شامل تھے دشمن کے دائیں بازو پر حملہ کرنے کا حکم دیا۔ قریش کے اسپ سوار اور شتر سوار ریت کی دلدل میں پھنسے ہوئے تھے اور ان کی نقل و حرکت سخت دشوار ہو گئی تھی ——— دیر تک جنگ جاری رہی ابوجہل بڑی شجاعت سے لڑتا رہا لیکن ایک طرف تو وہ مسلمانوں کی صفوں میں جو سیسہ پلائی ہوئی دیواروں کی طرح مضبوط تھیں کوئی رخنہ نہ ڈال سکا، اور دوسری طرف وہ اسلامی حملہ آور دستے کو پسپا کرنے میں بُری طرح ناکام رہا۔ نتیجتاً وہ اپنے رفقاء کے ساتھ میدان جنگ میں کام آیا۔ پھر قریش کے قدم اُکھڑ گئے اور وہ مکے کی طرف فرار ہو گئے۔ ان کے ستر آدمی ہلاک اور اسی قدر گرفتار ہوئے۔ مسلمانوں کے بارہ سپاہی شہید ہوئے۔

جنگ کے بعد آنحضرت صلعم نے بدر میں تین روز قیام کیا۔ میدان جنگ کا معائنہ کیا، اور اپنے ساتھیوں کو جا بجا بتاتے رہے کہ دشمن کا کونسا افسر کس جگہ گرا ہو گا۔ اس سے آپؐ کی اُس خود اعتمادی اور یکسوئی خیال پر روشنی پڑتی ہے جو جنگ کی اضطراری کیفیت میں بھی بدستور قائم رہی۔ پھر آپؐ نے تمام نعشوں کو دفن کرایا اور دو مبشر مدینے بھیجے تاکہ وہاں کے منتظر مسلمانوں کو فتح کی خوشخبری پہنچائی جائے۔

اُس عہد کے رواج کے خلاف آپؐ نے اسیران جنگ کے ساتھ نیک سلوک کیا،

انہیں کپڑے دیئے اور مسلمان سپاہیوں کے ساتھ کھانا کھلایا، اُن میں سے اکثر کو فدیہ لے کر چھوڑ دیا، بعضوں کو محض آیندہ جنگ نہ کرنے کے وعدے پر اور باقی ماندہ کو مسلمان بچوں کی تعلیم کے معاوضہ میں رہا کر دیا۔

جنگ کے اصول اور جنگِ بدر

اس جنگ کی تفصیلات پر غور کیجئے تو معلوم ہو گا کہ عہد حاضر میں ماہرین حرب نے صدیوں کی تاریخ کو سامنے رکھ کر جنگ کے جو بنیادی اصول قائم کئے ہیں اُن پر پیغمبرؐ اسلام ساتویں صدی ہی میں عمل کر چکے تھے ——— یہ اصول درج ذیل ہیں:۔

۱۔ اصلی مقصد کا پیش نظر ہونا

۲۔ اقدام

۳۔ اچانک حملہ

۴۔ اجتماع یا ارتکاز

۵۔ حفاظت

۶۔ قوت کے استعمال میں کفایت

۷۔ حرکت پذیری

۸۔ تعاون

یہاں ہم ان اصولوں پر روشنی ڈالیں گے جن پر آنحضرت صلعم نے جنگ بدر میں عمل کیا ہے۔

۱۔ اصلی مقصد ایک اچھے سپہ سالار کے پیش نظر اہم ترین مقصد دشمن کی اصلی فوج (Main force) کو تباہ کرنا ہوتا ہے لہذا ادھر اُدھر بھٹکنے کی بجائے اُسے اصلی موقعہ کی تلاش میں ہونا چاہیے۔ نپولین کہتا تھا کہ:۔

"میرے سامنے ایک ہی چیز ہوتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ دشمن کی اصلی فوج"

کلازوٹز اپنی کتاب "اصولِ جنگ" میں رقمطراز ہے کہ :-

"ہمارا مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ دشمن کے اصلی کالم پر حملہ کرکے اُسے تباہ کیا جائے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس مقصد کے حصول کے لیے ہمیں اپنا سارا زور لگا دینا چاہیئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کسی بڑے اور فیصلہ کن مقصد کو پوری قوت اور عزمِ مصمم کے ساتھ حاصل کرنے کی کوشش کی جانی چاہیئے"

دُور اندیش جرنیل اس اصول کو ہمیشہ پیش نظر رکھتے ہیں اور اپنی ساری توانائیوں کے ساتھ اس پر عمل کرتے ہیں - چنانچہ دوسری جنگ عظیم میں الامین کی لڑائی کے موقعہ پر جرمنوں کی ایک فوج شمالی علاقہ میں گھر گئی تھی - لیکن اتحادیوں کے سپہ سالار جنرل منٹگمری نے وہاں فیصلہ کن قوت کو مرکوز کرنے سے انکار کر دیا - اور اپنی فوجوں کو جرمنوں کی اصلی فوج پر حملہ کی غرض سے محفوظ اور مجتمع کر لیا -

فوجوں کی نقل و حرکت کے دوران میں دشمن کے بڑے بڑے شہروں کو آگے بڑھ کر فتح کرنے کا لالچ بسا اوقات سپہ سالاروں کے دل میں پیدا ہوتا ہے - لیکن دشمن کی اصلی فوج کو تباہ یا مغلوب کرنے سے پہلے ایسی فتح غیر مفید ثابت ہوتی ہے - چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جنگ بوئر میں انگریزوں نے اپنے دشمن کے دارالخلافہ پریٹوریا پر قبضہ کر لیا حالانکہ اُس وقت تک اصلی بوئر فوج کو شکست نہیں دی جا سکی تھی - اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگریزوں کی توجہ اور وسائل کے منتشر ہو جانے سے مزید دو سال تک اس جنگ کو جاری رکھنا پڑا اسی سبب سے دوسری جنگ عظیم میں جرمنوں نے پولینڈ کے دارالخلافہ وارسا کو فتح کرنے کی بجائے اپنے دشمن کی اصلی فوجوں کا پہلے صفایا کیا اور پھر وارسا کا خود بخود سقوط ہو گیا ۔

جنگ بدر کا خاص پہلو یہ ہے کہ اصلی مقصد ہی سپہ سالارِ اسلام کے پیش نظر رہا ہے - دشمن کی اصلی قوت کو تباہ کرنے کے لیے آپؐ نے حکیمانہ تدبیریں اختیار کیں اور جب ریت کے طوفان سے دشمن کے کیمپ میں ابتری پھیل گئی تو آپؐ نے ٹھیک موقع پر حملہ کر کے اُس کے قلبِ لشکر کو تباہ کر دیا -

۲- اقدام

قدیم چینی سپہ سالار جنرل سنتز و کے خیال کے مطابق دشمن کی شکست ہماری اقدام کی صلاحیت میں مضمر ہوتی ہے۔ ——— درحقیقت اقدام کے بغیر کوئی جنگ فیصلہ کن نتیجہ تک نہیں پہنچ سکتی، اور مجہول دفاع سے دشمن کی قوت کو تباہ نہیں کیا جا سکتا۔ یعنی دفاعی طریقۂ جنگ زخم پر مرہم کا کام تو کر سکتا ہے لیکن زخم کو مندمل کرنے کی اُس میں صلاحیت نہیں ہوتی۔ کلاز وٹز کہتا ہے کہ:-

"ہمیں اس طریقۂ جنگ (دفاعی) پر صرف اُس وقت تک عمل کرنا چاہیئے، جب تک کہ ہماری کمزوری ہمیں ایسا کرنے پر مجبور رکھے"

اور برن ہارڈی کے قول کے مطابق۔

"اقدام جنگ کا زیادہ طاقتور طریقہ ہے"

میجر جنرل رابنسن کہتا ہے کہ پہلی نظر میں دفاعی جنگ زیادہ بہتر معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ دفاعی فوج کو حسب ذیل سہولتیں حاصل رہتی ہیں۔

۱۔ خندقیں کھود کر وہ خود کو محفوظ کر سکتی ہے۔

۲۔ نشانہ پر آتش باری کر سکتی ہے۔

۳۔ اس کے اخراجات کم ہوتے ہیں۔

اس کے برعکس حملہ آور فوج کو یہ سہولتیں حاصل نہیں ہوتیں ——— لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس صورت حال کے باوجود حملہ آور فوج کو ہمیشہ فوقیت حاصل رہتی ہے۔ آگے بڑھنے کے جوش و خروش اور منزل تک پہنچنے اور مقصد کے حاصل کرنے کے جذبے سے ایسی قوت کی تخلیق ہوتی ہے جو دفاعی فوج کو کبھی نصیب نہیں ہو سکتی۔ دفاع کرنے والا اپنے دائیں بائیں دیکھتا رہتا ہے۔ جوں جوں حملہ آور آگے بڑھتے ہیں اُس کی پریشانی میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ اُسے یہ فکر لاحق رہتی ہے کہ کہیں اس کا میمنہ نرغے میں نہ آجائے کہیں میسرہ کو گھیرے میں نہ لیا جائے، کہیں سلسلہ رسد منقطع نہ ہو جائے — اس کے برعکس حملہ آور کو نقل و حرکت کی آزادی حاصل رہتی ہے۔ اور کسی بھی کمزور نقطہ پر وہ اپنی طاقت کو مرکوز کر سکتا ہے۔

اس اخلاقی کمزوری کے علاوہ دفاعی فوج کو مزید دشواریوں کا بھی مقابلہ کرنا کرنا پڑتا ہے۔ مثلاً

۱۔ ایک طویل دفاعی خط کی حفاظت کے لیئے اُسے اپنی فوج کو پھیلا دینا پڑتا ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کسی بھی نقطہ پر وہ اپنی طاقت کو مرکوز نہیں کر سکتی معہود سری جنگ عظیم میں اطالویوں کے پاس چوراسی ساحلی رجمنٹیں تھیں، لیکن تمام ساحل پر منتشر ہونے کی وجہ سے وہ کسی جگہ بھی اپنے دفاع کو مستحکم نہیں کر سکیں،

۲۔ دفاع سے دشمن کو پیش قدمی کا موقع ملتا ہے۔ وہ کسی ایک جگہ حملہ کرتا ہے۔ اور وہاں ابھی دفاعی قوت مجتمع ہونے بھی نہیں پاتی کہ وہ دوسرے نقطہ پر حملہ کر دیتا ہے، اور اس طرح دفاع کرنے والوں کی پریشانی میں اضافہ کا باعث ہوتا ہے

۳۔ حملہ آور کو وقت اور مقام کے انتخاب کا موقع حاصل رہتا ہے۔

۴۔ حملہ آور اچانک حملہ کر سکتا ہے۔

۵۔ طویل دفاعی خط کی حفاظت کے لیئے بہت زیادہ فوج کی ضرورت ہوتی ہے۔

۶۔ غیر محفوظہ علاقہ پر حملہ آور قبضہ کر سکتا ہے۔

۷۔ حملہ آور اپنے دشمن کی رسد کو لوٹ سکتا ہے۔ اُس کے سلسلۂ رسد کو کاٹ سکتا ہے۔

۸۔ دفاع کرنے والے فریق کی غیر متحارب آبادی کو نقصان کا اندیشہ رہتا ہے۔

۹۔ بسا اوقات دفاع کرنے والی حکومت سے اُس کی دوست حکومتیں قطع تعلق پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ زمانہ جنگ میں کوئی ہمسایہ حکومت صرف اُس وقت تک آپ کی حلیف رہ سکتی ہے جب تک کہ اُسے اس بات کا یقین رہتا ہے کہ آپ کا دفاعی خط ناقابل شکست ہے۔

۱۰۔ اقدام کرنے والی فوج اپنے زخمی سپاہیوں کو اُٹھا کر ہسپتال بھیج دیتی ہے

جہاں اُن میں سے اکثر صحت یاب ہو کر دوبارہ لڑنے کے لیئے میدان میں آجاتے ہیں لیکن دفاع کرنے والی فوج کے زخمیوں کو حملہ آور فوج گرفتار کر کے قید میں ڈال دیتی ہے۔

۱۰- حملہ آور کے لیئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ حملہ کے ہر نقطہ پر کامیاب ہو۔ ہو سکتا ہے، کہ وہ دس نقاط پر حملہ کرے جن میں سے نو نقاط پر اُس کے حملے پسپا کر دیئے جائیں لیکن اگر دسویں نقطہ پر بھی اُسے کامیابی ہو جائے تو فتح کے لیئے یہ کافی ہے۔ اس کے برعکس دفاعی فوج کے لیئے ضروری ہے کہ وہ ہر نقطہ پر کامیاب ہو۔ کیونکہ ایک بھی نقطہ پر شکست ہونے سے حملہ آور دفاعی خط کو توڑ کر آگے نکل سکتا ہے جس سے دفاعی فوجوں کا زغہ میں آکر منتشر ہو جانا لازمی امر ہے۔

پہلی جنگِ عظیم کی ابتدا دفاعی نظریہ کے تحت ہوئی تھی۔ اسی طرح دوسری جنگِ عظیم کا بھی آغاز ہوا۔ فرانس نے اپنی سرحدوں پر میزنو لائن (Maginot Line) بنائی جس کے متعلق سمجھا جاتا تھا کہ دشمن اُس کو کسی طرح عبور نہیں کر سکے گا۔ جرمنی نے بھی اس کے بالمقابل اپنی سرحدوں پر ایسے ہی زمین دوز مورچے قائم کر لیئے جن کا نام زیگفریڈ لائن رکھا گیا تھا ـــــــــ لیکن دفاعی خطوط کی حفاظت کے لیئے کثیر متحرک دستوں کی ضرورت پڑتی ہے تاکہ وقتِ ضرورت کسی نقطہ پر کسی حملہ کا مقابلہ کیا جا سکے لیکن یہ کام بہت مشکل ہوتا ہے کیونکہ اقدام کرنے والی فوج دفاعی خط کے ایک چھوٹے سے نقطہ پر اپنی ستّر فیصد قوت مرکوز کر سکتی ہے جس کے جواب کے لیئے دفاعی فوج کی زیادہ سے زیادہ دس فیصد قوت موجود ہوتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ فرانس کا دفاعی خط جرمن اقدام کی زیادہ دیر تاب نہیں لا سکا اور سارے فرانس پر جرمنی کا قبضہ ہو گیا

جنگِ بدر میں آنحضرت صلعم نے اپنی محدود فوج کے مدِ نظر دفاعی خط اگرچہ قائم کیا تھا تاہم مناسب وقت پر اچانک اقدام بھی کیا اور دشمن کے دائیں بازو پر اپنے دستوں کو جمع کر دیا۔ اس طرح آپ نے نہ صرف دفاعی جنگ ہی کے اصول پر عمل کیا بلکہ

اقدام اور اچانک حملہ کے اصولوں سے بھی پورا پورا فائدہ اٹھایا۔

۳۔ اجتماع اس اصول میں لشکر کشی (strategy) کا سارا فن موجود ہے جس کے مطابق کسی فیصلہ کن نقطہ پر دشمن کے مقابلہ میں بہتر فوجوں کو جمع کیا جاتا ہے۔ مختلف ماہرین نے اس اصطلاح کی تعریف مختلف الفاظ میں کی ہے۔ لیکن لفٹیننٹ جنرل برن کے الفاظ میں جس اصول کے تحت فوجوں کو میدان جنگ تک پہنچایا جاتا ہے اُسے "فن لشکر کشی" کہتے ہیں۔ اور میدان جنگ میں جس طریقہ کے تحت لڑایا جاتا ہے اُسے حربی چال (tactics) کہا جاتا ہے۔ حربی چال ہمیشہ بدلتی رہتی ہے۔

فن لشکر کشی کے حسب ذیل اصول ہیں۔

(ا) ایسی جگہ دشمن کو لڑنے پر مجبور کیا جائے جو ہمارے لیے مفید ہو۔

(ب) منتخبہ میدان جنگ میں دشمن سے پہلے پہنچا جائے۔ سنتزو کہتا ہے کہ "جو فریق میدان جنگ میں پہلے پہنچتا ہے وہ لڑائی کے وقت تازہ دم ہوتا ہے۔ جو بعد میں آتا ہے وہ تھکا ہوا ہوتا ہے"۔

(ج) اپنے دشمن کو اس امر کے سمجھنے کا موقع نہ دیا جائے کہ اُسے کس چیز کی مدافعت کرنی چاہیئے اور کس جگہ حملہ کرنا چاہیئے۔

(د) سنتزو کہتا ہے۔

"کہ دشمن کو پہلے ہی سے یہ معلوم نہ ہونے دیا جائے کہ آپ کس جگہ لڑنا چاہتے ہیں کیونکہ ایسی صورت میں اُسے ہر ممکن نقطہ پر تیار رہنا پڑے گا اور اس طرح اس کی فوج منقسم اور نتیجتاً کمزور ہو جائے گی۔

(ھ) دشمن کو مجبور کیا جائے کہ وہ اپنا منصوبہ ہم پر ظاہر کر دے۔

(و) دشمن کی فوجیں جب منظم حالت میں ہوں تو اُن میں گھس جانے کی کوشش نہ کی جائے۔

(ز) غیر متوقع راستوں سے حملہ کیا جائے۔

(۳) سٹنرو کہتا ہے۔

"تمام حالات پر غور کرنے کے بعد اپنے سپاہیوں کو ایسے موقف میں لے آئیے کہ جہاں سے پسپائی ممکن نہ ہو تاکہ وہ بے جگری سے لڑائی کریں"۔

اس بحث کی روشنی میں دیکھئے تو معلوم ہو گا کہ اسلامی لشکر کی بدر تک آمد اور پھر بدر کے میدان میں اس کی نقل و حرکت فن لشکر کشی کے عین مطابق تھی۔ آنحضرت صلعم ایسے راستوں سے بدر تک پہنچے کہ دشمن کو اس کی اطلاع تک نہ ہو سکی اور یہ بات اس کی سمجھ میں نہ آسکی کہ آپؐ دراصل تجارتی قافلہ پر حملہ کرنا چاہتے ہیں یا لشکرِ قریش سے مقابلہ کے لئے بڑھ رہے ہیں۔ وہ یہ بھی سمجھنے سے قاصر رہا کہ آپ کس جگہ مقابلہ کرنے والے ہیں۔

۴۔ حفاظت جنگ میں فوجوں کی حفاظت کی بڑی بھاری ذمہ داری سپہ سالار پر عائد ہوتی ہے۔ لیکن اس کی ضرورت سے زیادہ فکر بھی وبال جان ہو جاتی ہے۔

مارشل فاکش کہتا ہے کہ:

"جو شخص ہر چیز کی حفاظت کرنا چاہتا ہے وہ ہر چیز کھو بیٹھتا ہے۔ اقدام میں نسبتاً زیادہ تحفظ کی صورت ہوتی ہے۔

رابنسن (Robinson) کا قول ہے۔

"لڑائی میں تحفظ کی بہترین شکل یہ ہے کہ آپ اپنے ارادہ کو دشمن پر مسلط کر دیں۔

جنگ بدر میں آنحضرت صلعم نے حفاظت کی تمام ممکنہ صورتیں اختیار فرمائی تھیں۔ آپؐ نے اگلی صفوں کی حفاظت کے لیے بہترین جگہ پر تیر اندازوں کو مقرر کیا تھا اور ساری فوج کی حفاظت کے لیے محفوظ دستے بھی متعین فرمائے تھے۔

۵۔ قوت کا محتاط استعمال فوجوں کی تقسیم بہت غور و فکر کے بعد ہونی چاہیئے۔ یہ تقسیم ایسی ہو جس سے ہر سپاہی کو اپنی صلاحیت کے مطابق کام کرنے کا موقع ملے اور نتیجتاً ہمیں زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل ہو سکے۔۔۔ لیکن محاذ

پر تھوڑی سی فوج رکھ کر باقی کو بغیر کسی مقصد کے عقب میں محفوظ رکھ لینا بھی کوئی عقلمندی نہیں ہے۔ جن نقاط پر حملہ کا امکان نہ ہو وہاں حالات کے مدنظر تھوڑی فوج رکھی جائے اور ما بقی کو فیصلہ کن لڑائی کے لیئے استعمال کیا جائے۔

محفوظ افواج کا رکھا جانا بہت ضروری ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ان کا آزادانہ استعمال نہ کیا جائے۔

محفوظ افواج کو میدان میں لایا جائے تو اُن کی جگہ اور افواج کا انتظام کر لیا جانا بھی از حد ضروری ہے۔ کیونکہ دشمن ہمارے کسی حصّہ کو نرغے میں لینے کی کوشش کرے تو محفوظ افواج جو عقب میں ہوں ہماری مدد کو آسکتی ہیں۔

سن تزو کہتا ہے کہ :-

"دشمن کو نرغہ میں لینے کے بعد اپنی قوت اور اپنے وسائل کا جائزہ لیجیئے۔ اگر اُسے کچل دینا آپ کے بس میں ہو تو اُس کا بالکل صفایا کر دیجیئے، ورنہ اُسے بے جگری سے لڑنے پر مجبور نہ کیجیئے بلکہ ایک طرف سے نکل جانے کے لیئے راستہ دیدیجیئے۔"

سپہ سالارِ اسلام نے بھی جنگ بدر میں اپنی مختصر سی قوت کا استعمال بڑی احتیاط سے کیا۔ تین سو تیرہ سپاہیوں کو نہ صرف میمنہ اور میسرہ میں تقسیم کیا بلکہ محفوظ دستے بھی ان میں سے علیحدہ کئے اور دشمن پر اُس وقت تک تیر اندازی نہیں کی جبتک کہ وہ پوری طرح زد میں نہیں آگیا اور تیروں کے ضائع ہونے کا احتمال باقی نہ رہا ــــــ جنگ ختم ہونے کے بعد آپ نے اپنی ساری طاقت کا جائزہ لیا اور دیکھا کہ اپنے پاس اونٹوں کی بہت کمی ہے۔ اسی لیے آپ نے اُسے گھیرے میں لینے کی بجائے پسپا ہو جانے کا موقع دیا۔ ورنہ اس بات کا احتمال تھا کہ وہ بے جگری سے لڑنے پر مجبور ہو جاتا اور مسلمانوں کو بھی نقصان برداشت کرنا پڑتا۔

۶۔ حرکت پذیری — یہ فی نفسہ کوئی اصول نہیں ہے بلکہ دیگر دو اصولوں ہر اچانک حملہ اور افواج کے اجتماع کو روبہ عمل لانے کے لیئے

ایک ضروری خصوصیت ہے ۔" رفتار " اس کا لازمی جزو نہیں ہے ۔ البتہ منصوبہ کی لچک اور سادگی اس میں شامل ہے ۔

جنرل ٹوکر کہتا ہے کہ جنگ کی ہمیشہ سے یہ خصوصیت رہی ہے کہ اس میں ہر فریق نقل و حرکت کا اختیار اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتا ہے ۔ کیونکہ اس اختیار کی بدولت آپ اپنی پسندیدہ جگہ پر آخری میدانی جنگ کر سکتے ہیں ۔

۱۹۴۱ء میں جاپان کی حرکت پذیری معراج پر تھی ۔ اُس نے جنوب مشرقی ایشیا میں اپنی برّی بحری اور ہوائی فوجیں پھیلا دیں اور برطانوی اور امریکی بحریہ پر سخت حملے شروع کیے جس کے باعث امریکہ کی بحری قوت کمزور پڑ گئی اور برطانیہ کی ہوائی طاقت کو بھی سخت صدمہ پہنچا نتیجتًا جاپان کو بے شمار فتوحات حاصل ہوئیں اور اُس کا حلقۂ اثر وسیع سے وسیع تر ہو کر پھیلا گیا ۔

لیکن جنگ میں اصولًا صرف اُسی قدر رقبہ پر قبضہ کرنا چاہیے جس کے انتظام اور استحکام کے لیے ہمارے وسائل وافر اور انتظامی استعداد کافی ہو —— جاپان نے اس اصول کو نظر انداز کر دیا ۔ اس کی فوجیں وسیع علاقوں پر پھیل گئیں جن کی حفاظت کے لیے اُس کے پاس اسی تناسب سے نہ وسائل تھے اور نہ انتظامی صلاحیت موجود تھی ۔ اس کے برعکس رفتہ رفتہ امریکہ اور برطانیہ کی ہوائی اور بحری طاقت میں اضافہ ہوتا گیا اور اس کے ساتھ ساتھ جنگ کا نقشہ بھی بدلتا چلا گیا —— امریکہ کے بحریہ نے جاپانی فوجوں کی نقل و حرکت کو معطل کر دیا اور جاپان اپنی فوجیں ایسے مقامات پر منتقل کرنے کے قابل نہیں رہا جہاں کہ اُن کی ضرورت ہوتی تھی ۔ چنانچہ ۱۹۴۲ء کے متعدد معرکوں میں جاپان کی بڑی فوج تباہ ہو گئی اور اُس کی پے در پے شکستوں کا سلسلہ جاری ہی تھا کہ بالآخر ناگاساکی اور ہیروشیما میں ایٹم بم کی ہلاکت خیزیوں نے تمام امور کا قطعی فیصلہ کر دیا ——!

باوجود اونٹوں اور گھوڑوں کی کمی کے جنگ بدر میں لشکر اسلام کی حرکت پذیری حیرت انگیز رہی ہے ۔ مکہ سے بدر تک مجاہدین اسلام نہایت تیزی سے آئے ، نہایت سرعت سے اپنے مورچے قائم کرتے رہے اور لڑائی کے میدان میں برق کی رفتار سے دشمن کی صفوں پر حملے کرتے رہے ۔

۷ ۔ تعاون

اس کی دو صورتیں ہیں ۔

۱ ۔ ایک ہی فوج کے سپاہیوں اور مختلف دستوں میں تعاون

۲۔ دو مختلف اتحادی فوجوں میں تعاون

جنگ بدر میں مسلمانوں کی کامیابی کا ایک بڑا سبب اُن کا باہمی تعاون ہی تھا۔ تیر اندازوں نے ٹھیک وقت پر تیر برسانے اور اقدام کرنے والے دستوں نے بھی مناسب وقت پر آگے بڑھ کر حملہ کر دیا۔ عورتوں اور سانڈنی سواروں نے بھی اپنے اپنے فرائض نہایت دلیری اور پھرتی سے انجام دیئے۔

دیگر عناصر

امور ذیل ہر جنگ میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔

۱۔ زمین کا استعمال

۲۔ حربی چالیں (Tactics)

۳۔ جاسوسی

۴۔ منصوبہ کی سادگی۔

۵۔ تعاقب

جنگ بدر میں یہ تمام امور سپہ سالار اسلام کے پیش نظر تھے۔

زمین کا استعمال

زمین سے دو فائدے ہو سکتے ہیں :-

(ا) دشمن کی پیش قدمی میں رکاوٹ پیدا ہو سکتی ہے۔ اور کسی نقطہ تک پہنچنا اُس کے لیئے دشوار ہو سکتا ہے۔ زمین کی مشکلات کے باعث وہ بہت آہستہ آہستہ بڑھنے یا اپنی صف بندی کو بدلنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

(ب) ہم اپنی فوجوں کو پوشیدہ رکھ کر لڑائی میں فائدہ اٹھا سکتے ہیں ــــــ حملہ اور دفاع دونوں کے لیے یہ صورت مفید ہوتی ہے۔

زمین کی رکاوٹوں میں جھاڑی، کھائی، دلدلی زمین، ندی، نالہ، جھیل اور پہاڑ شامل ہیں۔ جو فوجیں ان کے پیچھے ہوتی ہیں اُن کی دفاعی قوت میں بڑا اضافہ ہو جاتا ہے۔

لڑائی میں نشیبی زمین کا انتخاب مضر ہوتا ہے۔ روشنی اور دھوپ کا بڑا خیال رکھنا پڑتا ہے تاکہ لشکر میں بیماریاں نہ پھیل سکیں۔ اس امر کو بھی ملحوظ رکھنا پڑتا ہے کہ لڑائی کے وقت سورج ہمارے سپاہیوں کے منہ پر نہ ہو۔

ہم اگر پہاڑ پر ہوں تو دشمن ہم تک پہنچتے پہنچتے تھک جاتا ہے اور اُس کی صف بندی قائم نہیں رہ سکتی۔ چھوٹی ندیوں کو عبور کرنے میں دشمن کی اگلی صفیں منتشر ہو جاتی ہیں اور اُسے از سرِ نو صف بندی کرنی پڑتی ہے۔ اس صورت حال سے ہم فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

پہاڑوں کے بلند مقامات پر ہمیں اپنے کیمپ قائم کرنے چاہییں۔ پہاڑ کا وہ حصّہ بہتر ہوتا ہے جہاں دھوپ آتی ہو اور میمنہ اور عقب کی سمتیں ڈھلوان ہوں۔

پہاڑوں کی حفاظت کے لیے خندقیں کھودی جاتی ہیں اور درّوں کی نگرانی کے لیے معقول انتظام کیا جاتا ہے۔ اس غرض کے لیے فوج کا کم از کم تیسرا حصّہ محفوظ رکھا جاتا ہے تاکہ دشمن کے اُن دستوں پر حملہ کیا جا سکے جو درّوں سے گزرنے میں کامیاب ہو جائیں۔

بہتر تکنیک کے مطابق فوج کے کسی ایک بازو کو زمین کی رکاوٹ سے محفوظ کر لیا جاتا ہے اور دوسرے بازو کو اقدام کے لیے تیار رکھا جاتا ہے۔ لیکن زمین کی رکاوٹوں کے باوجود خندقوں کا کھود لیا جانا مفید ہوتا ہے تاکہ زمین کی رکاوٹوں کو دشمن عبور کرے تو اس پر خندقوں سے آتشباری (تیر اندازی) کی جا سکے۔

زمین کی رکاوٹیں صرف دفاع کے لیے مفید ہو سکتی ہیں کیونکہ اگر ہم خود پیش قدمی کرنا چاہیں تو یہی رکاوٹ ہمارے لیے سدِ راہ بن جاتی ہے ..... بہر حال زمین کی رکاوٹوں سے صرف جزوی فائدہ اس حد تک اٹھایا جانا چاہیے کہ ان کی مدد سے تھوڑی سی فوج کے ذریعے دشمن کے حملہ میں مزاحمت پیدا کی جائے اور اس عرصہ میں کسی دوسرے نقطہ پہ فوجوں کو مجتمع کر کے دشمن کو شکست دی جائے۔

آنحضرت صلعم نے جنگ بدر میں زمین کا ماہرانہ استعمال کیا۔ آپ نے چشمہ پر پوری طرح قبضہ

کر لیا۔ تیر اندازوں کو بہترین جگہ متعین کیا اور اس بات کا بھی لحاظ رکھا کہ جنگ کے وقت سورج کی شعاعوں سے مسلمانوں کی آنکھیں چوندھیانہ جائیں۔ نیز اپنی نقل و حرکت سے دشمن کو ایسی جگہ پڑاؤ ڈالنے پر مجبور کیا جو ریتلی ہونے کے باعث اُس کے لیئے بالآخر بڑی مشکلات کا باعث ہوگی!

۲۔ حربی چالیں

سنتزو کہتا ہے کہ۔

۔تمام جنگوں کی بنیاد دھوکہ ہے۔ اِس لیئے اگر آپ حملہ کے قابل ہوں تو دشمن پر ظاہر کیجیئے کہ آپ حملہ کے قابل نہیں ہیں۔ آپ کی فوجیں حرکت میں ہوں تو ظاہر کیجیئے کہ وہ بیکار پڑی ہیں۔ جب آپ مصروف ہوں تو دشمن کو محسوس کرائیے کہ آپ نکمے ہو گئے ہیں، آپ نزدیک ہوں تو دُور ہونے اور اگر دور ہوں تو نزدیک ہونے کا تاثر پیدا کیجیئے۔ دشمن کو پھندے میں لانے کی سعی کیجیئے، اور اُس کی تنظیم میں انتشار پیدا کر کے اُس کا صفایا کر دیجیئے۔

لڑائی میں حسب ذیل امور کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

۱۔ دشمن کی پشت کا راستہ جس سے وہ بصورتِ شکست پسپا ہو سکے کاٹ دیا جائے۔

۲۔ ایسی نقل و حرکت کی جائے جس سے دشمن کے محاذ کا رُخ دفعتاً تبدیل ہو جائے اور اُس کی تنظیم بگڑ جائے۔

۳۔ ایسی نقل و حرکت کی جائے کہ دشمن کی فوج چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم ہو جائے

۴۔ دشمن کی رسد کے سلسلہ کو منقطع کر دیا جائے۔

۵۔ دشمن پر ایسی جگہ وار کیا جائے جہاں وہ بچاؤ نہ کر سکے۔ یا یہ وار ایسے وقت کیا جائے جب کہ بچاؤ کے متعلق وہ تذبذب میں ہو۔

۶۔ دشمن کے کمزور مورچہ پر زبردست حملہ کیا جائے۔

جنگ بدر میں ایک ہزار مسلح سپاہیوں کے مقابلہ میں تین سو تیرہ بے وسیلہ مسلمانوں کی کامیابی آنحضرت صلعم کی دانشمندانہ حربی چالوں اور فنی مہارت پر دلالت کرتی ہے۔ آپ نے کمالِ تدبر سے دشمن کے بڑھتے ہوئے دستوں کو قریب تر آنے کا موقع دیا اور جب وہ پوری طرح زد میں آ گئے تو تیر اندازوں کو حکم دیا کہ نہایت تیزی سے تیر اندازی کی جائے۔ دشمن تیروں سے

کی اس خوفناک بوچھاڑ کا بچاؤ نہ کر سکا اور نتیجتاً اس کی صفیں منتشر ہو گئیں اور سخت جانی نقصان برداشت کر کے اُسے پسپا ہونا پڑا۔

۴۔ جاسوسی فوج خواہ کیسی ہی کیوں نہ ہو بغیر جاسوسوں کی امداد کے کامیابی کا حاصل کیا جانا مشکل ہوتا ہے۔ فتح کے لیے ضروری ہے کہ ہمیں دشمن کے وسائل اور ارادوں نیز اُس کی نقل و حرکت کا پہلے ہی سے علم ہو۔

سنتزو کہتا ہے کہ:

"اگر آپ اپنی اور دشمن کی طاقت سے اچھی طرح واقف ہوں تو سو لڑائیوں سے بھی خوف نہ کیجیے۔ اگر آپ اپنے سے تو واقف ہوں لیکن دشمن کی قوت سے ناواقف ہوں تو ہر فتح کے لیے آپ کو بھی نقصان برداشت کرنا پڑے گا۔ لیکن اگر آپ اپنے سے لاعلم اور دشمن کی قوت سے بے بہرہ ہوں تو ہر لڑائی میں آپ کو شکست ہونا ضروری ہے۔"

جاسوسوں کی حسب ذیل قسمیں ہوتی ہیں۔

۱۔ مقامی جاسوس

۲۔ اندرونی جاسوس یعنی خود دشمن کے افسر

۳۔ اسیران جنگ

۴۔ مصنوعی جاسوس۔ یعنی ایسے جاسوس جن کے ذریعے آپ غلط اطلاعات دشمن کو فراہم کریں گے۔

۵۔ دلیر جاسوس جو دشمن کے کیمپ تک پہنچ کر خبریں لاتے ہیں۔

لشکر اسلام کے لیے جاسوسی کا مکمل انتظام آنحضرت صلعم نے کر رکھا تھا۔ آپ کی ہر جنگ میں جاسوسوں نے نہایت خوبی کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیئے جس کے باعث لڑائی کے بہترین منصوبہ کی ترتیب اور فوجوں کی کامیاب نقل و حرکت ممکن ہو سکی تھی۔ جنگ بدر میں بھی آپؐ کی اطلاعات کا انتظام مکمل تھا۔ دشمن کی ہر حرکت کی خبریں آپؐ کو مل رہی تھیں اور جنگ کے دوران میں سانڈنی سوار پھرتی سے ساتھ پیغام رسانی کر رہے تھے۔

منصوبہ کی سادگی

ہر اچھا سپہ سالار اس امر کا خیال رکھتا ہے کہ جنگ کا منصوبہ اُس کے وسائل اور بساط سے باہر نہ ہو۔ بہترین جنگی منصوبہ میں تغیر پذیری کی صلاحیت بھی ہوتی ہے تاکہ وقت ضرورت بغیر کسی دشواری کے اس میں ترمیم یا تبدیلی کی جا سکے۔

پیغمبر اسلام کا جنگی منصوبہ بھی نہایت سادہ اور لچکدار تھا۔ آپ کی جنگی چالوں سے دشمن کو نہ صرف محاذ کی سمت بدلنی پڑی بلکہ ایک ایسی جگہ اپنا محاذ قائم کرنے پر مجبور بھی ہونا پڑا جہاں نہ پانی تھا نہ جانوروں کے لیے چارہ بلکہ جہاں سورج منھ کی طرف تھا ہوا مخالف سمت سے چل رہی تھی، اور زمین ریتلی اور دلدلی ہونے کے باعث سواروں کے لیے سخت پریشانی کا موجب ہوگئی تھی!

۵۔ تعاقب

کلازوٹز اور ہنڈرسن اسے ایک اصول قرار دیتے ہیں۔ لیکن فی نفسہٖ یہ کوئی اصول نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق لشکر کشی اور حربی چالوں سے ہے تعاقب سے فتح مکمل ہوتی ہے۔ چنانچہ کلازوٹز کہتا ہے کہ :-

"تعاقب کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ ہمارے سوار تعاقب کر کے دشمن کی اخلاقی حالت کو خراب کر دیتے ہیں"

جنگ بدر میں آپ نے دشمن کا تعاقب نہیں کیا ۔۔۔ کیوں؟ جواب یہ ہے کہ آپ کے پاس اونٹوں کی بہت کمی تھی۔ بدر تک پہنچنے کے لیے بھی کئی کئی سواروں کے حصہ میں ایک ایک اونٹ آیا تھا جس پر وہ باری باری بیٹھتے تھے۔

مسلمانوں کی برتری

جنگ کے اجزائے ترکیبی کے لحاظ سے بدر کے معرکہ پر نظر ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ پہلے تین اجزا[1] میں مسلمانوں کو برتری حاصل تھی۔ البتہ چوتھے جزو کے اعتبار سے قریش فوقیت رکھتے تھے۔ ۔۔۔ ابوجہل پر سرداران قریش کو اعتماد نہیں رہا تھا۔ اور آنحضرت صلعم کی اعصابی جنگ نے لشکر قریش پر ہیبت طاری کر رکھی تھی۔ نیز مسلمانوں کے عزم اور جوش و خروش سے وہ

[1] یعنی سپہ سالار کی شخصیت، فوجوں کی صلاحیت، اور اخلاقی حالت، مادی وسائل۔

اس قدر مرعوب ہوگئے تھے کہ اُن کے اکثر سردار بغیر لڑے بھڑے واپس ہو جانے کو ترجیح دے رہے تھے۔ قریش نے ایک شخص عمیر بن وہب کو لشکرِ اسلام کی حالت دریافت کرنے کے لیے بھیجا تھا۔ اُس نے مسلمانوں کا بغور مطالعہ کر کے یہ رپورٹ پیش کی تھی کہ اُن کی تعداد اگرچہ بہت کم ہے لیکن اُن کے جذبۂ جاں نثاری کی کوئی حد نہیں ہے۔ موت کا خوف اُن کے دل سے زائل ہو چکا ہے اور وہ نہایت بے جگری سے لڑنے کے لیے تیار کھڑے ہیں۔ عمیر بن وہب کی اس رپورٹ سے کفّار کے حوصلے اور بھی پست ہو گئے تھے اور فتح کی اُمید کی بجائے شکست کا خوف اُن کے دل میں سما گزین ہو گیا تھا ــــــ اور اس طرح اس جنگ نے اس حقیقت کو ثابت کر دیا کہ محض وسائل کی افراط اور سپاہیوں کی کثرت فتح و نصرت کے لیے کافی نہیں ہے بلکہ ایمان کی قوت، اور دل کی طاقت بسا اوقات اقلیت کو اکثریت پر غالب کر دیتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ !!

كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللّٰهِ

کتنی ہی چھوٹی جماعتیں ہیں جو بڑی جماعتوں پر حکمِ الٰہی سے غالب آ گئیں!

جنگ کے اصولوں کا اطلاق

کلازوٹز کہتا ہے کہ جنگ کے اصول فی نفسہٖ نہایت سادہ اور عام فہم ہوتے ہیں۔ لیکن جنگ کو عملی طور پر چلانا بہت مشکل کام ہے۔ جنگ کا نقشہ اور منصوبہ مرتب کرنا بھی آسان ہے۔ البتہ جنگ کے اصولوں پر آخر تک سختی سے عمل کرنا دشوار ہے۔

جنگ کی کاروائی ایک پیچیدہ مشین کی طرح ہوتی ہے جس کے مختلف پرزوں میں رگڑ پیدا ہوتی رہتی ہے۔ جن حربی کاروائیوں کا نقشہ ہم بڑی آسانی سے کاغذ پر مرتب کر لیتے ہیں اُن کو روبہ عمل لانا بہت دشوار ہوتا ہے۔

سپہ سالار کے ذہن و فکر کو بڑی مزاحمتوں کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے جن پر غالب آنے کے لیے دل و دماغ کی غیر معمولی صلاحیتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان مزاحمتوں کی تفصیلات کا دیا جانا ممکن نہیں ہے تاہم یہ کہا جا سکتا ہے کہ حسبِ ذیل اسباب سے ان کی تشکیل ہوتی ہے۔

۱۔ ہمیں دشمن کے مورچے اور منصوبے کا ٹھیک ٹھیک اندازہ نہیں ہوتا۔ اس لیے اقدام کرتے وقت پیش آنے والے حالات کے بارے میں بے شمار شکوک اور شبہات پیدا ہوتے ہیں اور ہم کسی فیصلہ کے قابل نہیں رہتے۔

۲۔ ہمیں دشمن کی قوت کا صحیح اندازہ نہیں ہوتا نیز ہمارے جاسوسوں اور دیگر ذرائع سے آئی ہوئی افواہیں ہمارے اندازہ پر مؤثر ہوتی ہیں۔ لوگ بالعموم بزدل ہوتے ہیں اور خطرات کی اطلاعات کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں۔ یہ تمام باتیں سپہ سالار کے دل و دماغ پر اثر کرتی ہیں اور اُس کی قوت فیصلہ کمزور پڑ جاتی ہے۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہوتی ہے کہ سوچ سمجھ کر منصوبہ مرتب کیا جائے۔ اور اس کے بعد ان خبروں سے پریشان ہونے کی بجائے اُن پر ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے اور مزید خبروں کے حاصل کرنے کی کوشش جاری رکھی جائے تاکہ حقیقت حال کا اندازہ ہو سکے۔ اس پر بھی شک رفع نہ ہو تو پھر کسی بات کی پرواہ نہ کی جائے بلکہ جرأت اور استقلال کے ساتھ اپنے منصوبہ کو روبہ عمل لانے کی سعی شروع کر لی جائے کیونکہ بغیر خطرات کے مقابلہ کے کوئی اہم نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا اور نہ محض کسی ایک معمولی غلطی سے ہم بُری طرح تباہ ہو سکتے ہیں۔

۳۔ ان حالات میں خود اپنی فوج کی تنظیم کے متعلق بھی شبہات پیدا ہوتے ہیں۔ اس لیے ایسے ماتحت افسروں کا انتخاب کیا جائے جن پر ہمیں پورا اعتماد ہو۔ اور فوج کو ایسی حالت میں رکھا جائے کہ اُس کا کسی وقت بھی معائنہ ہو سکے۔

...... اس کے ساتھ ہی ساتھ ہمیں اپنے منصوبہ پر مکمل اعتماد ہونا چاہیئے۔ اگر تمام خطرات کو ملحوظ رکھ کر منصوبہ ترتیب دیا گیا ہو تو اس کو روبہ عمل لانے کے لیے پورے عزم اور یقین کے ساتھ قدم اٹھانا چاہیے۔

۴۔ جب پوری قوت کے ساتھ ہم آگے بڑھتے ہیں تو بسا اوقات ہمارے ماتحت افسر اور سپاہی دل برداشتہ ہو جاتے ہیں۔ کبھی وہ دشمن کی طاقت سے مرعوب ہوتے ہیں اور کبھی راستہ کی دشواریوں کو دشوار اور ہم کو خطرناک سمجھنے لگتے ہیں اگر ہم اُن کی باتوں

پر توجہ دینا شروع کریں تو اپنے منصوبہ کے بارے میں ہمارا ایقان متزلزل ہو جاتا ہے اور قوتِ فیصلہ کمزور پڑ جانے سے ناکامی کی صورت پیدا ہوتی ہے۔ اس لیے ضرورت اس امر کی ہوتی ہے کہ اپنے ایقان اور دُور اندیشی پر حصر کیا جائے۔ اور نہایت استقلال اور ثابت قدمی سے اپنی مہم کو جاری رکھا جائے!

۵۔ ہر کارروائی کے نتائج ہماری توقع کے مطابق برآمد نہیں ہوتے۔ کبھی ہم اپنی پیشقدمی کے متعلق غلط اندازہ لگاتے ہیں، کبھی کسی نقطہ تک پہنچنے میں توقع سے زیادہ وقت لگ جاتا ہے، کبھی ہماری کسی چوکی کی مزاحمت قبل از وقت ٹوٹ جاتی ہے۔ اور کبھی راستہ کی رکاوٹوں پر غالب آنے کے لیے اندازہ سے زیادہ وقت صرف ہو جاتا ہے۔

۶۔ ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھ کر سوچا جائے تو بالعموم اپنی فوجوں کے متعلق خوش فہمی پیدا ہوتی ہے۔ لیکن یہ فوجیں جب میدانِ جنگ میں مصروفِ عمل ہوتی ہیں تو اُن کی کمزوریوں کا علم ہونے لگتا ہے۔ . . . . تاہم ان کمزوریوں کے باوجود حوصلہ شکن حالات میں بھی ہم کامیاب ہو سکتے ہیں۔ اگر ہم قوتِ ارادی، عزم اور استقلال سے کام لیتے رہیں۔

آنحضرت صلعم کے سامنے بھی یہ دشواریاں موجود تھیں لیکن صحت مند غور و فکر، شجاعت اور ثابت قدمی سے آپ نے ان کا ازالہ کر دیا تھا۔ کسی جنگ میں آپ آخری لمحہ تک بھی مایوس نہیں ہوئے۔ بلکہ پورے ایقان کے ساتھ اپنی فوجوں کو جنگ کے اصولوں کے مطابق لڑاتے رہے اور یہی سبب ہے کہ متعدد مرتبہ انتہائی نازک حالات میں بھی ان اصولوں کے فوائد ظاہر ہوئے جن کی بدولت جنگ کے نقشے بدل گئے۔

تاریخ کی دُوسری جنگوں سے مُقابلہ

تاریخ عالم کی بعض اہم جنگوں سے جنگ بدر کا مقابلہ کیا جائے تو آنحضرت صلعم کی حربی قابلیت کا بہتر اندازہ ہو سکتا ہے اور اس امر کی وضاحت بھی ہو جاتی ہے کہ آپؐ تاریخ عالم کے ممتاز ترین جرنیل ہیں۔

مثال کے طور پر مندرجہ ذیل ممتاز جنگوں کو پیش کیا جاتا ہے جو فنِ حرب کے لحاظ سے بہت اہم سمجھی جاتی ہیں۔

١۔ جنگ خادیش ۔ سنہ ١٢٨٨ ق۔م

٢۔ جنگ اربیلا ۔ سنہ ٣٣١ ق۔م

٣۔ جنگ ٹریبیا ۔ سنہ ٢١٨ ق۔م

٤۔ جنگ رمی لانس ۔ سنہ ١٧٠٦ع

٥۔ جنگ بیر ہاشم ۔ مئی ۔ اکتوبر سنہ ١٩٤٢ع

جنگ خادیش

١٢٨٨ ق۔م میں مصری جرنیل ریمیسؑ حتیّ بادشاہ (King of Hettites) سے جنگ کرنے کے لیے تیس روز میں چار سو میل کا فاصلہ طے کر کے ایلاہ پہنچا جہاں اُسے دو آدمی ملے۔ انہوں نے کہا کہ ہم حتیّ فوج کے مفرور سپاہی ہیں اور ہماری طرح بہت سی فوج بغاوت پر آمادہ ہے اس لیے عجلت سے کام لیا جانا ضروری ہے۔ انہوں نے بتایا کہ حتیّ فوج الیپو کے مقام پر ہے جو خادیش سے بہت دُور ہے، اور ان حالات میں خادیش پر قبضہ کر لینا آسان ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ خادیش تک پہنچنے کے لیے قریبی پل کو عبور کیا جائے تو بہتر راستہ مل سکتا ہے . . . . . ریمیس نے ان کی باتوں کو باور کر کے پل کو عبور کیا اور آگے نکل گیا۔ وہ تیزی سے بڑھتا چلا گیا۔ صرف ایک ڈویژن فوج موسومہ عمان اس کے ساتھ جا سکی۔ باقی فوج پیچھے رہ گئی۔ اس پل سے آٹھ میل دُور خادیش سے ایک

میل کے فاصلہ پر رمسیس نے عمان کا کیمپ قائم کیا ——— اسی اثنا میں کچھ لوگ گرفتار ہوکر آئے جنہوں نے رمسیس کو بتایا کہ دشمن شہر خادیش پر قابض ہے اور اس کی ساری فوج شہر کے عقب میں پڑی ہوئی ہے۔ اس وقت رمسیس کو پتہ چلا کہ پہلے دو آدمی دراصل دشمن کے جاسوس تھے جو اسے جال میں پھانسنے کے لیے آئے تھے، لیکن رمسیس غلطی کر چکا تھا۔ اس کے لیے صورتِ حال نازک تھی کیونکہ اس کی باقی تمام فوجیں اس سے دور اور منتشر تھیں۔ اتنے میں دشمن کے رتھ گاڑوں نے اس پر حملہ کر دیا۔ عمان کے کیمپ کا سقوط ہو گیا۔ لیکن حملہ آوروں نے تعاقب کی بجائے کیمپ میں لوٹ مار شروع کر دی . . . . رمسیس کیمپ کے باہر نکل چکا تھا اس نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور بچے کچھے سپاہیوں کو لے کر لوٹ کھسوٹ کرنے والی منتشر فوجوں پر مسلسل حملے شروع کر دیئے۔ حتّی بادشاہ نے مزید ایک ہزار رتھ گاڑے میدان کارزار میں جھونک دیئے۔ لیکن کوئی بات نہیں بنی اس نے پیادہ فوج کو استعمال نہیں کیا اور نہ خود دریا کو عبور کر کے میدان میں آیا۔

اتنی دیر میں جنوب کے جنگل سے رمسیس کی باقی فوجیں بھی پہنچ گئیں اور انہوں نے شدید حملہ کر کے ان گاڑوں کو نرغے میں لے لیا۔ حتّی بادشاہ نے اس موقع پر دریا کو عبور کرنا چاہا مگر وہ ڈوب کر مر گیا۔ اور رتھ گاڑے دونوں طرف سے حملوں کی تاب نہ لا کر فرار ہونے لگے۔ خادیش کے قریب پل پر بھیڑ ہو گئی اور دریا کے مغربی کنارے پر تمام حتّی سپاہی قتل کر دیئے گئے۔

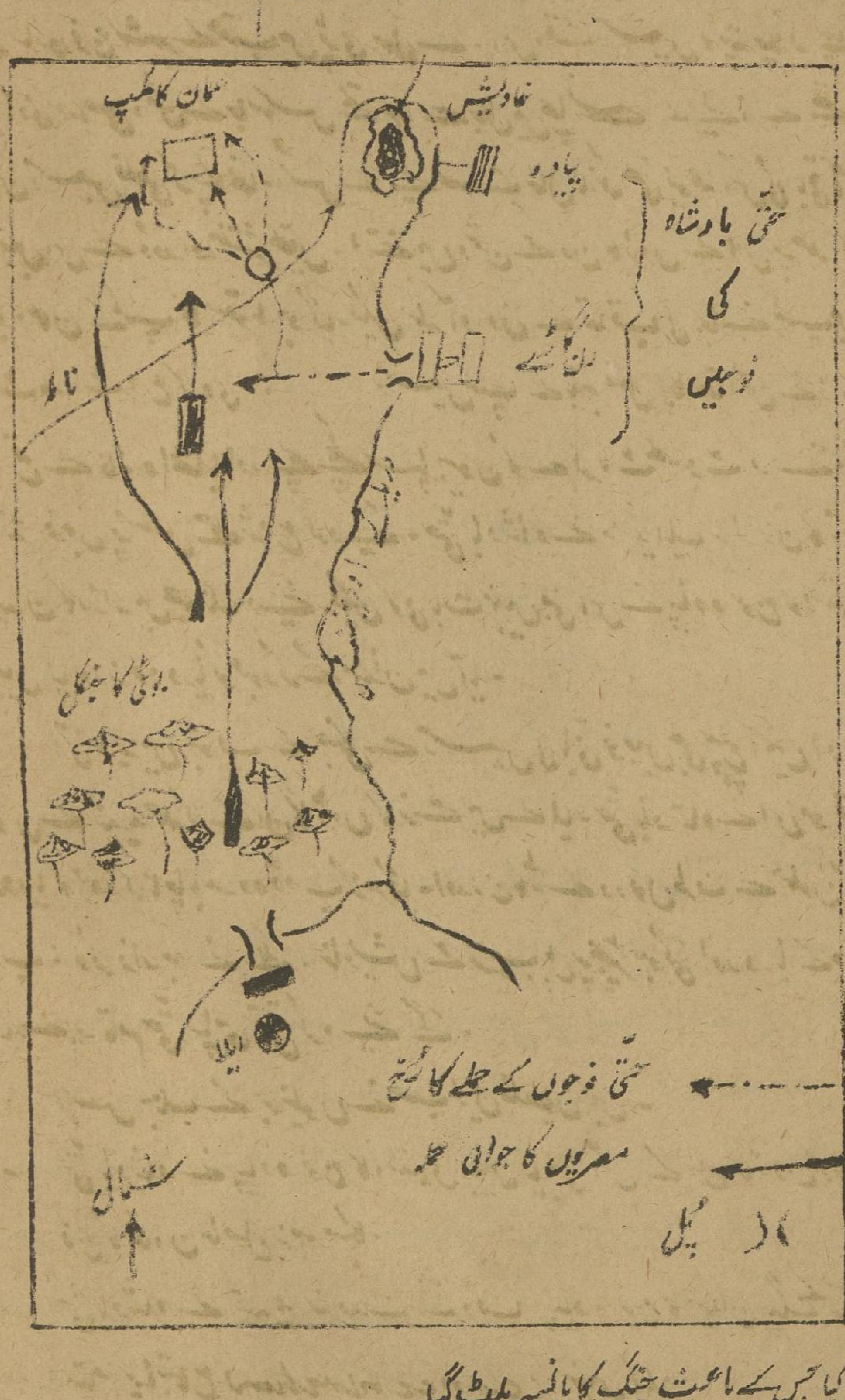
اس جنگ کے جرنیلوں نے حسب ذیل غلطیاں کیں۔

۱۔ حتّی بادشاہ نے پیادہ فوج کا استعمال نہیں کیا یعنی اس کے رتھ گاڑوں کو پیادہ فوج کا تعاون حاصل نہ ہو سکا۔

۲۔ حتّی بادشاہ نے شدید ضرورت کے وقت پیادہ فوج کا میدان جنگ کے مناسب مقام پر اجتماع (Concentration) نہیں کیا۔

۳۔ حتّی بادشاہ کی فوج نے عمان کے کیمپ کے سقوط پر اپنے دشمن کا تعاقب

جنگ قادیش ۱۲۸۸ ق م



نہیں کیا جس کے باعث جنگ کا پانسہ پلٹ گیا

۴ - ہٹیس نے تعاون کے اصول کو نظر انداز کیا اور تھوڑی سی فوج کو لے کر آگے

شکل کیا جس کی وجہ سے پچھلی فوجیں بروقت اُس کی مدد کو نہ آسکیں ۔

لیکن رسس کی کامیابی تعاون ہی کے اصول کی بدولت ہوئی ۔ جب پچھلی فوجوں نے آگے بڑھ کر اُس کے ساتھ تعاون کیا تو جنگ کا نقشہ ہی بدل گیا ۔

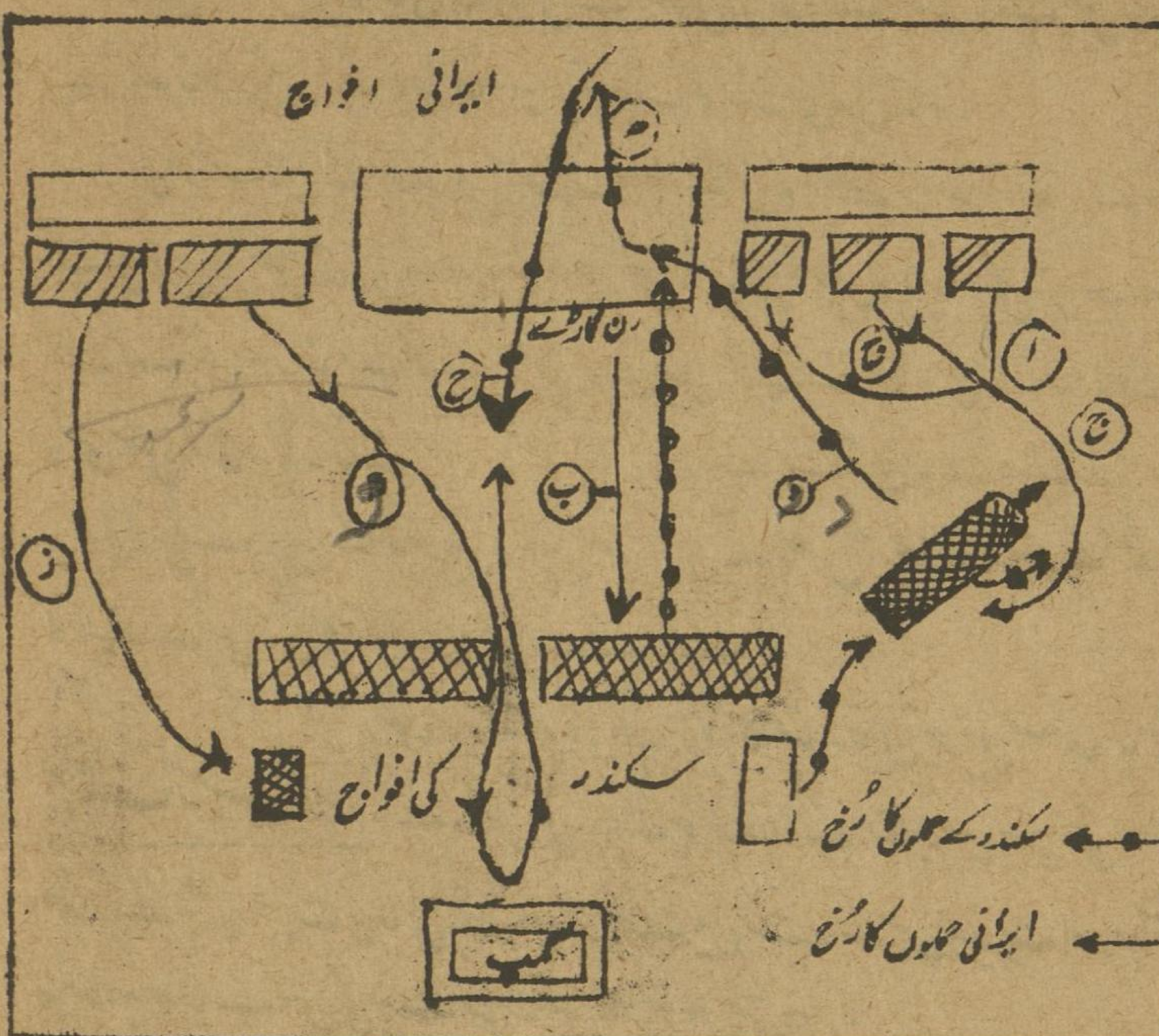
ان جرنیلوں کے مقابلہ میں آنحضرت صلعم کے عمل کو دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے ۔ کہ آپ کی افواج میں مکمل تعاون اور ہم آہنگی موجود تھی ۔ آپ کی فوجیں مربوط شکل میں میدان جنگ تک آئیں اور مناسب موقع پر مجتمع کر دی گئیں ۔ آپ نے جاسوسی اور اطلاعات کا بھی مکمل انتظام کر رکھا تھا ۔ . . . . . . اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ رسس کی فوج اُس کے دشمن کے مقابلہ میں کم نہیں تھی ، اس کے برعکس آنحضرت صلعم کے لشکر کو اپنے سے تگنی فوج کا مقابلہ کرنا تھا ——— !

جنگ اربیلا

سکندر اعظم یونانی عہد قدیم کا ممتاز ترین جرنیل سمجھا جاتا ہے ۔ اُس کی یہ جنگ جو کہ دارا کے مقابلہ میں ہوئی تھی ۔ فنی اعتبار سے بڑی اہمیت کی حامل ہے ۔ میدان جنگ میں سکندر نے جس بصیرت اور مہارت کا مظاہرہ کیا ہے اس کی بہت کم مثالیں تاریخ میں ملتی ہیں ۔

ماہِ اکتوبر ۳۳۱ ق م میں دارا و سکندر کی فوجیں صف آرا ہوئیں ۔ ایرانی بھاری فوجیں جو عقبی حصہ میں تھیں لڑائی میں حصہ نہیں لے سکتی تھیں ۔ لہٰذا وہ انتشار کا باعث ہوئیں ۔ پہلے ایرانی سواروں نے حملہ (ا) کیا لیکن اس کو پسپا کر دیا گیا ۔ پھر ایرانی رن گارڈوں نے پیش قدمی (ب) کی اور ساتھ ہی ایرانی سواروں نے گھیرے میں لینے کے لیے مکرر حملہ (ج) کیا اس موقع پر سکندر نے دیکھا کہ دشمن کے قلب لشکر میں خلا پڑ گیا ہے ۔ اس لیے اُس نے پوری قوت سے اس نقطہ پر حملہ (د) کر دیا جو کہ فیصلہ کن ثابت ہوا ۔ وہ پھرتی سے آگے (ھ) بڑھتا گیا اور ایرانی سپاہی پیچھے ہٹتے گئے ۔ لیکن دوسری طرف ایرانی میمنہ نے یونانی کیمپ اور بازو پر حملے (و) اور (ز) کر دیئے ۔ اس مقام کے متعینہ یونانی سردار نے سکندر کو کہلا بھیجا کہ ایرانی دباؤ سخت ہوتا جا رہا ہے ۔ اس لیے آپ لوٹ کر ہماری مدد کریں ۔ لیکن سکندر نے جواب دیا کہ میں اہم ترین حملہ میں مصروف

جنگ اربیلا ۳۳۱ سنہ ق م



ا۔ ایرانی سواروں کا ناکام حملہ

ب۔ ایرانی رن گاڑوں کا حملہ

ج۔ کیمپ سے بچ لینے کے لیے ایرانی سواروں کا حملہ

د۔ سکندر کا حملہ

ہ۔ سکندر تعاقب کر رہا ہے۔

و۔ یونانی کیمپ پر حملہ

ز۔ ایک پہلو پر ایرانی حملہ

ح۔ سکندر کا مراجعتی حملہ

ہوں، تم لوگ مزاحمت کئے جاؤ . . . . سکندر کا حملہ جاری رہا اور جب ایرانی قلب لشکر تباہ ہو گیا تو وہ اپنے کیمپ کی طرف لوٹ آیا اور ایرانی میمنہ کے حملہ آور دستوں کو دونوں طرف سے نرغے میں لے کر تہہ تیغ کر دیا۔

اس کے خاص پہلو یہ ہیں ۔

۱۔ یونانی افواج کو سکندر کی ذات پر کامل اعتماد تھا۔

۲۔ سکندر نے اطلاعات کا مکمل انتظام کر رکھا تھا۔

۳۔ وہ عقابی نگاہوں سے معرکہ کارزار کو دیکھتا رہا، اور مناسب موقع پر اپنی بہترین طاقت کو مرکوز کر کے دشمن کو پسپا کرنے میں کامیاب ہوا۔

۴۔ قوت کا اس نے محتاط استعمال کیا۔

وہ رات بھر نقشہ پر غور کرتا رہا اور ایرانی رن گارڈوں اور جنگی ہاتھیوں کے جواب کے لئے ترچھے حملہ کا منصوبہ اس نے مرتب کیا۔ اور اس طرح دارا کو حیرت میں ڈال دیا اس نے اپنے اصلی مقصد کو برقرار رکھا۔ چنانچہ قلب لشکر کے تعاقب اور تباہی میں اس نے پورا زور لگا دیا۔

۷۔ اس کی فوجوں کی اخلاقی حالت بہتر تھی۔

۸۔ اس کی فوجوں میں حرکت پذیری کی اعلیٰ صلاحیت موجود تھی۔

جنگ بدر کا مقابلہ جنگ اربیلا سے کیا جائے تو حسب ذیل امور کی طرف آپ کی توجہ مبذول ہو گی۔

۱۔ کسی فتح سے فوجوں کا اعتماد سپہ سالار کو حاصل ہو سکتا ہے لیکن فتح سے پہلے ایسے اعتماد کا پیدا کیا جانا مشکل ہے —— سکندر کی ابتدائی فتوحات نے اس کے سپاہیوں کے دل میں اس کی شخصیت کی عظمت قائم کی تھی اور انہی کامیابیوں کی بنا پر اس کی فوجیں آئندہ جنگ کے میدانوں میں اس پر بھروسہ کر سکتی تھیں لیکن آنحضرت صلعم کی فوجوں کے لیے یہ پہلا موقع تھا گو یا نہیں آپ کی فنی مہارت کا کوئی تجربہ اس وقت تک نہیں تھا لیکن اس کے باوجود اسلامی لشکر نے مکمل

اعتماد آپ پر کیا اور ہر سپاہی سخت حملہ کے دوران میں بھی آپ کے احکام کی پوری پوری تعمیل کرتا رہا۔

۲۔ سکندر نے ایرانی قلب لشکر کے ایک حصّہ (ب) کو آگے بڑھنے دیا اور جب ایرانی میسرہ نے بھی اقدام (ج) کیا تو اس نے اپنے دستوں کے ذریعے ایک طرف سے حملہ (د) بول دیا۔ اسی طرح آنحضرت نے بھی دشمن کے قلب لشکر کو آگے بڑھنے دیا اور مناسب موقع پر اپنے محفوظ دستوں سے کفّار کے دائیں بازو پر حملہ کر لیا۔

۳۔ دارا کی صف بندی ناقص تھی۔ اس کی بھاری فوجیں پیچھے رکھی گئی تھیں جس کی وجہ سے وہ لڑائی میں حصّہ نہیں لے سکیں بلکہ انتشار کا باعث ہوئیں۔ اس کے برعکس قریش کی صف بندی بہت اچھی تھی اور اُن کے سواروں اور شتر سواروں کا کوئی جواب آنحضرت صلعم کے پاس نہیں تھا۔ صرف ایک ہی صورت آپ کے لیے ممکن تھی وہ یہ کہ ان سواروں کی نقل و حرکت میں مشکلات پیدا کی جائیں چنانچہ آپ نے کمالِ تدبر سے ایسی چالیں چلیں کہ لشکرِ کفّار کو ریتلے علاقہ میں اپنا پڑاؤ ڈال دینا پڑا۔ اور جب لڑائی شروع ہوئی تو کفّار کے گھوڑے اور اونٹ ریتلے دلدل میں پھنسنے لگے، ان کی نقل و حرکت مشکل ہو گئی اور وہ بے دم ہو کر ابوجہل کی مدد کرنے سے قاصر رہ گئے۔

۴۔ میدانِ جنگ میں سپہ سالار کی شخصیت روشنی کا ایک مینار ہوتی ہے۔ کہتے ہیں کہ سکندر نے اپنی شخصیت کے رعب میں اضافہ کرنے کے لیے جنگ کے روز نہایت چمکدار اور شاندار وردی زیبِ تن کی تھی . . . . لیکن آنحضرت صلعم کی شخصیت مکمل ہونے کی بدولت آرائش سے بالاتر تھی۔

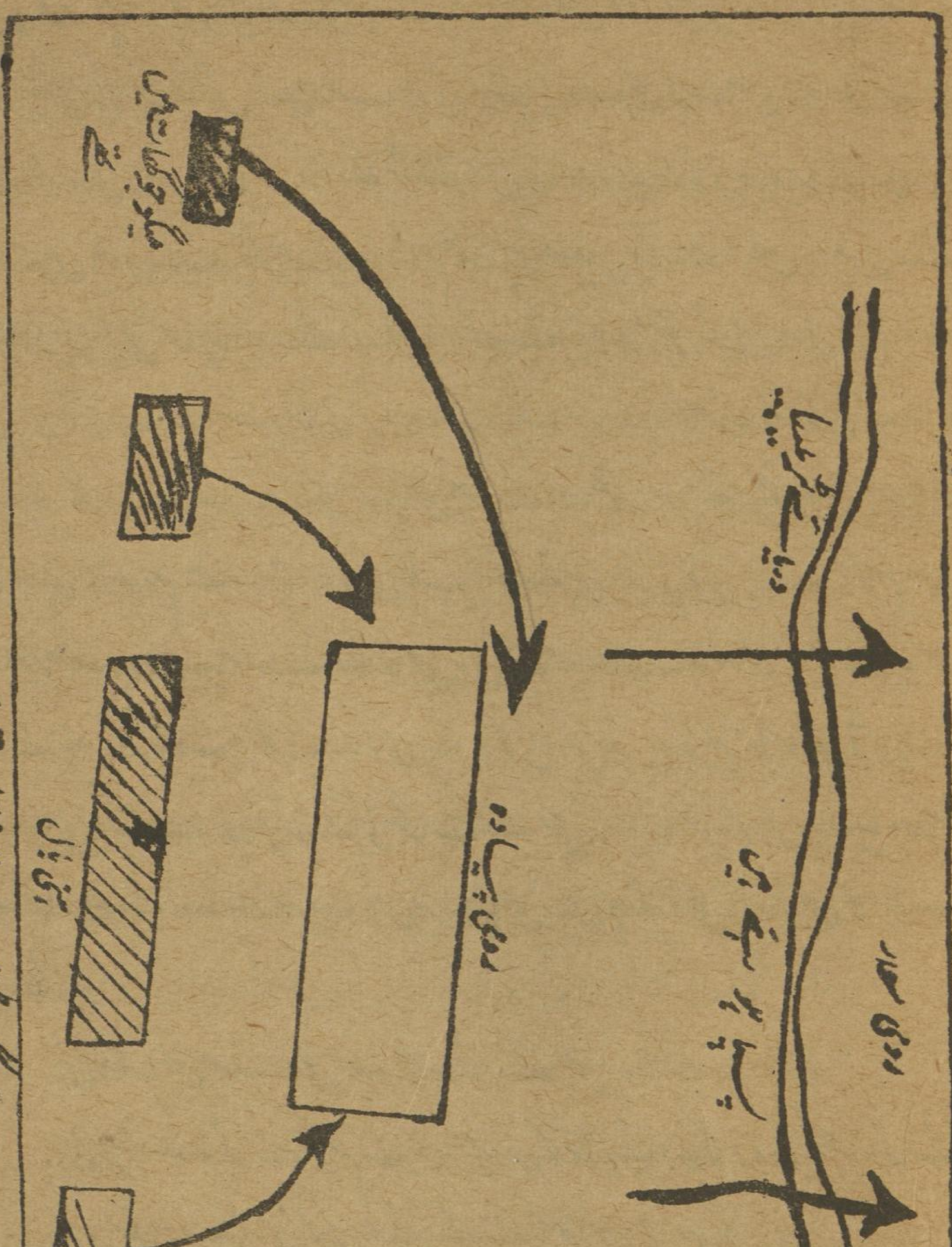
۵۔ سکندر کی فوجیں بہترین اسلحہ سے لیس تھیں۔ لیکن سرکارِ مدینہ کے سپاہی بے سروساماں تھے۔ اُن کے ہتھیار پرانے اور گھسے ہوئے تھے۔

۶۔ یونانی افواج کا مقابلہ نگمی افواج سے نہیں تھا۔

جنگ ٹریبیا

ہنی بال کا شمار دنیا کے مشہور جرنیلوں میں ہوتا ہے۔ اُس کی وہ جنگیں جو جنگ ٹریبیا اور جنگ کینی کے نام سے موسوم ہیں ماہرینِ حرب

کی توجہ کا مرکز رہی ہیں۔ یہاں صرف جنگ ٹریبیا کا ذکر کیا جاتا ہے۔



دریائے ٹریبیا کی ایک جانب رومیوں اور دوسری جانب ہنی بال کی فوجوں سے

پڑاؤ ڈالے تھے۔ میدان جنگ میں اُس فریق کو نقصان کا اندیشہ رہتا ہے۔ جس کی پشت دریا کی طرف ہو۔ ہنی بال نے اسی حقیقت کے مدنظر رومی لشکر کو دریا کے اس پار لانے کی کوشش کی۔ چنانچہ اُس نے چند سپاہیوں کو دریا کی دوسری طرف بھیج کر رومی کیمپ پر حملہ کرایا۔ رومی فوجیں مشتعل ہو کر آگے بڑھنے لگیں۔ ۲۶ دسمبر ۲۱۸ ق م کو برف باری کی حالت میں انہوں نے دریا کو عبور کیا اور شام تک اپنی صفیں درست کر لیں۔ انہوں نے درمیان میں ہاتھی اور پیادہ رکھے اور لڑائی کے لیئے تیاری مکمل کر لی۔ ہنی بال نے بھی اسی ترتیب سے صف بندی کی اور اپنے ایک سردار میگو کو محفوظ دستوں کے ساتھ ایک جگہ گھات میں بٹھا دیا۔ رومی سپاہی بھوکے اور تھکے ہوئے تھے۔ لیکن ہنی بال کے سپاہی تازہ دم تھے۔ ابتداً رومی قلب لشکر نے ہنی بال کی فوج پر ایک ناکام حملہ کیا اور جب وہ پسپا ہونے لگا تو ہنی بال کے سواروں نے رومی سواروں پر حملہ کر کے انہیں دریا تک بھگا دیا۔ رومی پیادہ فوج اس طرح غیر محفوظ ہو گئی تو ان سواروں نے دریا کی طرف سے اور میگو نے اپنی گھات سے نکل کر اُسے نرغے میں لے لیا۔ رومیوں کے چھکے چھوٹ گئے اور صرف دس ہزار سپاہی جان بچا کر نکل جانے میں کامیاب ہو سکے۔

اس جنگ میں حسب ذیل امور اہمیت رکھتے ہیں۔

۱- ہنی بال نے تدبر سے کام لے کر رومیوں کو ترغیب دی کہ وہ دریا عبور کر کے ایسی جگہ صف آرائی کریں جو اُن کے لیے ناموزوں تھی۔

۲- دریا عبور کر کے صف آرائی کرنے تک رومی تھک چکے تھے اور بھوکے ہو گئے تھے۔

۳- ہنی بال نے اصلی مقصد یعنی رومیوں کے قلب لشکر کی تباہی کو پیش نظر رکھا۔ چنانچہ اُس کے سواروں نے جو رومی سواروں کا تعاقب کر رہے تھے۔ اپنے تعاقب کو جاری نہیں رکھا بلکہ قلب لشکر کو نرغے میں لینے کے لیے لوٹ آئے۔

۴- بازوؤں پر حملہ کر کے ہنی بال نے رومیوں کو دہرے گھیرے . . . . . .

(DOUBLE ENVELOP) میں لے لیا۔

۵۔ میگو کے اچانک حملے نے رومیوں کو بدحواس کر دیا۔

اس جنگ کا مقابلہ جنگ بدر سے کیجئے تو حسب ذیل صورتیں واضح ہو جاتی ہیں۔

۱۔ ہنی بال کی طرح آنحضرت صلعم نے بھی قریش کو ناموزوں جگہ پڑاؤ ڈالنے پر مجبور کیا تھا زمین کے استعمال میں دونوں جرنیلوں کی بصیرت قابل ستائش ہے۔

۲۔ رومیوں کی طرح قریش بھی میدان میں تھکے ہوئے تھے۔ کیونکہ دلدلی زمین کے باعث نقل وحرکت میں اُن کی بڑی توانائی صرف ہو گئی تھی۔

۳۔ ہنی بال کی طرح اصلی مقصد آنحضرت صلعم کے پیش نظر تھا

۴۔ میگو کی طرح آپؐ کے محفوظ دستوں نے اچانک حملہ کر کے قریش کو بدحواس کر دیا تھا۔

۵۔ آپ کے محفوظ دستوں نے قریش کے بازو پر حملہ کر کے اکہرے گھیرے کی صورت پیدا کی تھی۔

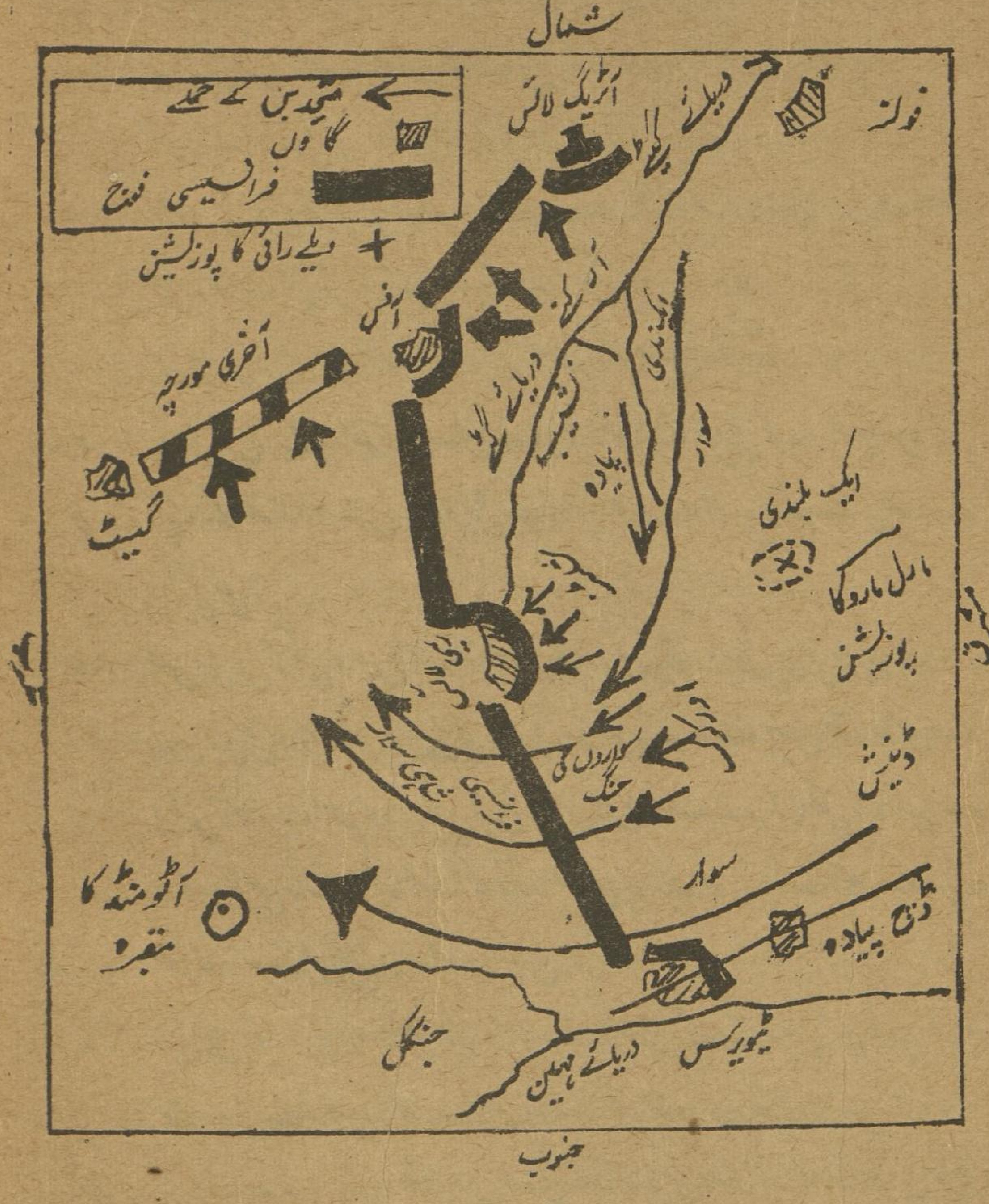
۶۔ لیکن ہنی بال کو تنگی فوج کا سامنا نہیں تھا۔ اُس نے رومیوں ہی کی طرح اپنی صف بندی کر لی تھی اور سپاہیوں کی کمی کا کوئی مسئلہ اُس کے سامنے نہیں تھا۔ اس کے برعکس آنحضرت صلعم کو اپنی قلیل فوج کی اس طرح صف بندی کرنا تھی کہ دشمن کے حملہ کو روکا بھی جا سکے، حفاظت کا انتظام بھی ہو سکے اور اچانک حملے کے لیے محفوظ دستے بھی علیحدہ رکھے جا سکیں۔

۷۔ ہنی بال ہتھیار اور وسائل کے لحاظ سے رومیوں کے مقابلہ میں کسی طرح کمتر نہیں تھا۔ اس کے برعکس آنحضرت صلعم کے وسائل محدود اور ہتھیار ناقص تھے۔

جنگ بریمی ہلائس

اٹھارویں صدی کے آغاز میں انگلستان کا مایۂ ناز جرنیل مالبارو فلنڈرس کی سرزمین پر اپنی فنی مہارت کی مہر ثبت کر رہا تھا۔ اُس کی دُور اندیشی، معاملہ فہمی، وجاہت اور شخصیت کو آج بھی بطور مثال پیش کیا جاتا ہے اور چرچل بھی اُسے خراجِ عقیدت پیش کرنے میں فخر محسوس کرتا ہے۔ ۔ ۔ ۔

جنگ ریمی لائس سنہ ۱۷۰۶ء



فرانسیسی فوج کا قلب موضع ریمی لائس پر تھا۔ اس کا میمنہ ٹیویریس تک اور میسرہ آفس اور آٹریگ لائس تک پھیلا ہوا تھا۔ ان دونوں سمتوں میں زمین ڈھلوان ہے۔ لیکن معاً نے گیٹے کے مشرق میں زمین پھر اونچی ہوتی گئی ہے۔ اسی مشرقی علاقہ میں ایک چھوٹی سی ندی بہتی ہے جس کے اور دریائے گیٹے کے درمیان ایک چھوٹا سا ٹیلہ واقع ہے اس

کے سبب سے یہ ندی فرانسیسی خطوط سے نظر نہیں آ سکتی تھی ...... یہ علاقہ اس جنگ میں بڑی اہمیت کا حامل رہا ہے۔

فرانسیسی جرنیل ویلے رائی آفس کے شمال میں تھا۔ مارل بارو نے مخالف سمت میں ایک بلندی پر اپنا مورچہ قائم کیا تھا۔ فرانسیسی سواروں کی اکثریت میمنہ پر تھی جن میں شاہی سوار نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔

جنگ کا آغاز اس طرح ہوا کہ مارل بارو کے میمنہ نے آہستہ آہستہ پیش قدمی شروع کی۔ ویلے رائی سمجھا کہ اس اقدام سے اس کے میسرہ پر دباؤ بڑھ گیا ہے۔ چنانچہ اپنے قلب لشکر سے کئی دستے اس نے میسرہ کی امداد کے لیے بھیجے ...... مارل بارو اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔ اس کا منشا یہی تھا کہ فرانسیسی قلب میں خلا پیدا ہو جائے۔ تاکہ اس پر حملہ کر کے اسے تباہ کیا جا سکے۔ اس نوبت پر متحدین کے میمنہ اور میسرہ نے ایک ہی وقت حملہ کر دیا۔ ان کا میمنہ آر کنے کی سرگرمی میں آفس کے اندر گھس گیا اور میسرہ (ڈچ پیادہ) نے ٹیوریس پر قبضہ کر لیا۔

اس کے بعد اور کرک کے ڈچ سواروں نے ریمی لانس کے جنوب میں فرانسیسی سواروں پر حملہ کیا جن میں شاہی سوار بھی شامل تھے اور جن کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ مارل بارو نے اپنے میمنہ سے سواروں کی کافی تعداد اور کرک کی امداد کے لیے بھیجی اور

....

....

اس طرح چرچل کے الفاظ میں دنیا کی سب سے بڑی سواروں کی لڑائی شروع ہوئی مارل بارو گھوڑے سے اتر گیا اور شدید معرکہ میں قتل ہوتے ہوتے بچ گیا۔ جنگ کی اس شدت کے مدنظر آر کنے کے دستوں کو واپس بلا لیا گیا جو چھوٹی ندی کے نشیبی علاقے سے گزرتے ہوئے اور کرک کی امداد کو پہنچ گئے۔ فرانسیسی انہیں دیکھ نہ سکے لیکن ان کے پہنچنے سے پہلے ہی متحدین کے سوار صورت حال پر قابو پا چکے تھے۔

فرانسیسی سواروں کے قدم اکھڑنے ہی کی دیر تھی کہ متحدین کے جرنیل شلڈن کی

سرکردگی میں پیادہ فوج نے ریمی لاکس پر قبضہ کر لیا اور ڈینش سوار آٹومنڈ کے مقبرہ تک پہنچ گئے۔ جنوب میں فرانسیسی سواروں کی پسپائی کا سلسلہ جاری رہا۔ متحدین کی فوجیں ریمی لاکس کے جنوب سے آگے نکل کر دائیں جانب پلٹ گئیں اور فرانسیسی فوجوں کے عقب میں متوازی خط میں آگے بڑھتی گئیں۔ اس کے ساتھ ہی مارل بارو نے اپنے ان محفوظ دستوں کو جو ٹیلے کی آڑ میں اس وقت تک خاموش کھڑے تھے حملہ کا حکم دے دیا فرانسیسی فوجیں ہر طرف سے نرغے میں آکر تباہ ہو گئیں۔ پانچ ہزار گرفتار کر لیے گئے۔ اور مارل بارو نے دُور تک دشمن کا تعاقب جاری رکھا۔

اس جنگ کے نمایاں خدوخال یہ ہیں۔

۱۔ مارل بارو نے زمین کا بہترین استعمال کیا۔ ٹیلے کی بلندی اور چھوٹی ندی کے نشیب سے اس نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ اس نے اپنا کیمپ ایک ایسی بلندی پر قائم کیا جہاں سے میدانِ جنگ بالکل سامنے تھا۔ اس کے برعکس ویلے رائی نے زمین کا غلط استعمال کیا۔ جنوبی ڈھلوانی علاقے اور جنگل سے اس نے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا جو کہ اس کے میمنہ کے عقب میں واقع تھا۔

۲۔ مارل بارو نے اپنے اصلی مقصد کو برقرار رکھا۔ ریمی لائس پر فرانسیسی قلب لشکر کو شکست دینا اس کے پیش نظر تھا۔ اس لیے آرکنے کے دستوں کو اس نے مقام آفس سے واپس بلا لیا جسے وہ فتح کر چکے تھے۔

۳۔ مارل بارو نے اچانک حملہ کر کے اپنے دشمن کو حیرت میں ڈال دیا۔ اس کا میمنہ سواروں کے لیے ناموزوں تھا لیکن دشمن کو غلط فہمی میں ڈالنے کے لیے اس نے اپنے میمنہ میں زیادہ سوار رکھے اور دھوکہ دینے کی نیت سے انہیں آگے بڑھایا۔

۴۔ مارل بارو کی فوجوں میں مکمل تعاون تھا۔ اور مناسب موقعوں پر وہ اپنی فوجوں کو مجتمع اور مرکوز کرتا رہا۔

۵۔ مارل بارو کی فوج نے پھرتی اور حرکت پذیری کا بہترین ثبوت پیش کیا۔

۶۔ اپنے دشمن کا تعاقب کر کے اُس نے اُسے پُوری طرح تباہ کر دیا۔

جنگِ رمی لائس کے پس منظر میں جنگِ بدر کو ملاحظہ کیجئے تو امُورِ ذیل سامنے آتے ہیں:

۱۔ آنحضرت صلعم نے بھی زمین کا بہترین استعمال کیا تھا۔ مارل بارو نے آپؐ کی عریش کی طرح ایک بلند مقام پر اپنا مورچہ بنایا تھا۔

۲۔ زمین کے استعمال میں ویلئے رائی کی غلطی مارل بارو کی کسی چال کا نتیجہ نہیں تھی۔ لیکن قریش ریتلی اور دلدلی زمین پر اپنا پڑاؤ ڈالنے کے لیے آپؐ کے تدبر کی وجہ سے مجبور ہو گئے تھے۔

۳۔ آنحضرت صلعم نے بھی اپنے اصلی مقصد کو برقرار رکھا تھا۔ آپؐ کی فوجوں میں بھی مکمل تعاون تھا۔ اور آپؐ نے مناسب مواقع پر اپنے محفوظ دستوں کو مرکوز کر دیا تھا

۴۔ آپؐ نے بھی کافی دستے محفوظ رکھے تھے۔ جن کے ذریعے بہترین موقع پر اچانک حملہ کرا دیا تھا۔

۵۔ فوجوں کی ترتیب میں آپؐ نے اُن کی حفاظت اور سہولت کو پیش نظر رکھا تھا۔

۶۔ جنگِ رمی لائس میں متحدین کو جنگ کے چاروں اجزائے ترکیبی ——— سپہ سالار کی شخصیت اور قابلیت، فوجوں کی صلاحیت، اخلاقی حالت، اور وسائل کی افراط ——— حاصل تھے۔ لیکن آنحضرت صلعم کے وسائل دُشمن کے مقابلہ میں بہت کم تھے۔

۷۔ مارل بارو کی فوج نے اپنی حرکت پذیری کی برتری کو ثابت کیا تھا۔ کیونکہ اُن کے پاس گھوڑوں کی بھی کمی نہیں تھی۔ اس کے برعکس سپہ سالارِ اسلام کے پاس گھوڑے اور اونٹ نہ ہونے کے برابر تھے۔ تاہم آپؐ کے متحرک دستوں نے دُشمن پر اپنی برتری کو قائم رکھا تھا۔ اس کا ایک سبب یہ بھی تھا۔ کہ آپؐ نے اپنی حربی چالوں سے دشمن کی نقل و حرکت کی صلاحیت کو زائل کر دیا تھا۔

۸۔ مارل بارو کی فوج اقلیت میں نہیں تھی۔ اور وہ فرانسیسیوں کے مقابلہ میں سپاہیوں کی مساوی تعداد میدان میں جھونک رہا تھا۔ لیکن آنحضرت صلعم کے پاس تین قریشیوں کے مقابلہ کے لیئے صرف ایک مسلمان تھا۔

جنگِ بیرِ ہاشم جنوری ۱۹۴۲ء میں متحدین کی آٹھویں فوج بن غازی سے پسپا ہوئی۔ اس کے بعد اُسے حکم دیا گیا۔ کہ وُہ عزالہ پر دفاع قائم کرے۔ چنانچہ اس نے عزالہ سے بیرِ ہاشم تک ایک دفاعی خط سرنگوں کے ذریعے قائم کیا۔ اور دونوں مقامات کے درمیان ایک بریگیڈ رکھا۔ اس خط کے پیچھے تین مورچے قائم کیے گئے۔ جو ایک دوسرے سے علیحدہ تھے۔ ان کے پاس پانی اور رسد کا انتظام بھی نہیں تھا دراصل صحرا ... ان مورچوں کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی۔ نیز بیرِ ہاشم تک جو دفاعی خط قائم کیا گیا تھا۔ وُہ خود بھی ایک زائد ذمہ داری تھی۔ کیونکہ اس مقام پر پانی کی فراہمی اور اس کی حفاظت مشکل تھی ——— نتیجہ یہ ہُوا کہ روّمل کی فوج بیرِ ہاشم کے جنوبی حصّہ سے گزر کر حملہ آور ہوئی۔ حالانکہ اس حملہ کی ضرورت نہیں تھی۔ معمولی فوج سے اس مقام کا محاصرہ کر کے متحدین کو پریشان کیا جا سکتا تھا۔ لیکن روّمل نے اس کو فتح کر لینا ضروری سمجھا۔ اور اس غرض کے لیے اپنی بڑی فوج یہاں جھونک دی نتیجہ یہ ہوا کہ اس مقام کا سقوط تو ہو گیا۔ لیکن جرمنوں کو بھی سخت نقصان برداشت کرنا پڑا۔

بیرِ ہاشم کے سقوط کے بعد بڑی مشکل سے عزالہ کا تخلیہ کیا گیا۔ اور طبرق پر دفاعی خط قائم کیا گیا۔ لیکن اس کا بھی سقوط ہو گیا۔ اور پھر الحمرا اور اس کے بعد مرسی مطروح پر مورچے بنائے گئے۔ جرمنوں کے اقدام کے مدِنظر آخری مورچہ بھی برخاست کیا گیا۔ اور بالآخر العلمین کے دفاعی علاقہ میں روّمل کو روک دیا گیا۔

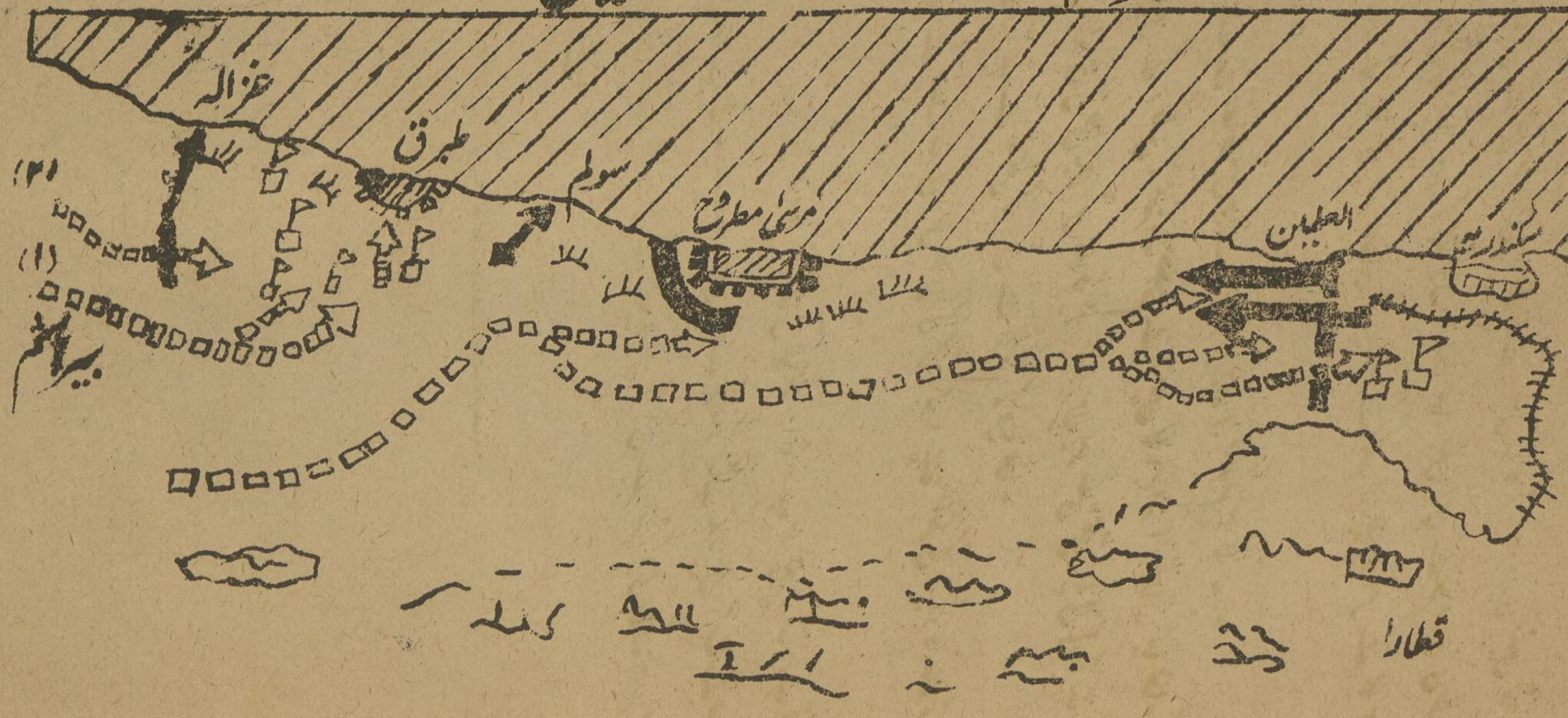
اس جنگ میں حسبِ ذیل امور قابلِ لحاظ ہیں :۔

۱۔ متحدین نے زمین کا صحیح استعمال نہیں کیا۔ بیرِ ہاشم پر اور اس کے پیچھے مورچوں کا قائم کیا جانا مصلحت کے خلاف تھا۔ ان مقامات پر پانی نہیں تھا۔ اور انہیں قلعہ بند کرنا حربی بصیرت کے منافی تھا۔

۲۔ متحدین نے فوجوں کی حفاظت کے اصُول کو نظر انداز کیا جس کے باعث اُن کا سخت جانی و مالی نقصان ہُوا۔

نقشہ: (ملاحظہ ہو نقشہ اگلے صفحہ پر)

جنگ بیرحکیم اور غزالہ سے العلمین تک (مئی تا اکتوبر ۱۹۴۲ء)



۳۔ رومل نے قوت کے محتاط استعمال (کفایت) کے اصُول کو نظرانداز کیا۔ بیر ہاشم اور اُن کے عقبی مورچوں پر حملہ کر کے انہیں تباہ کرنا ضروری نہیں تھا۔ وُہ ان کا محاصرہ کر کے وہاں کے سپاہیوں کو بھُوکوں مار سکتا تھا۔ لیکن اس نے غیر ضروری طور پر انہیں لڑنے پر مجبُور کر کے اپنا بھی کثیر نقصان کر لیا۔ صرف ایک مورچہ پر اُس کے پچاس دیابے ضائع ہو گئے۔

اس جنگ کے مقابلہ میں جنگِ بدر کو دیکھیئے تو معلُوم ہو گا کہ:۔

۱۔ متحدین کے برعکس آنحضرت صلعم نے زمین کا ماہرانہ استعمال کیا تھا۔ آپؐ نے ایسی جگہ صف بندی کی تھی۔ جو اُس علاقہ میں بہترین ہو سکتی تھی۔ پانی کی آپؐ کے پاس افراط تھی۔ اور آپؐ نے دُشمن کو اس سے محروم کر دیا تھا۔

۲۔ آپؐ نے صف بندی اس طرح کی تھی۔ کہ اپنے لشکر کی زیادہ سے زیادہ حفاظت ہو سکے۔

۳۔ قوت کا آپؐ نے محتاط استعمال کیا تھا۔ مناسب موقع پر مناسب قوت کیساتھ آپؐ کے حملے ہوتے تھے ـــــ یہی سبب تھا۔ کہ جنگِ بدر میں آپؐ کے صرف بارہ سپاہی شہید ہوئے تھے۔ اور اس کے مقابلہ میں دُشمن کے ستر آدمی ہلاک اور اسی قدر گرفتار ہو گئے تھے!

جنگِ اُحد

اسباب ابو سفیان نے جنگِ بدر کے مقتولین کا سوگ منانے کی ممانعت کی۔ اور مسلمانوں سے انتقام لینے کے لیئے دو سو شتر سوار تیار کیئے۔ اس لشکر کو لے کر نجد کی سمت سے۔ وُہ مدینے کی طرف روانہ ہوا۔ اور کوہِ تیت پر آ کر رُک گیا۔ جو یثرب سے ایک منزل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ اُس نے مدینے کے چند سرداروں سے سازش کی کوشش کی اور اس غرض کیلئے ایک مرتبہ وُہ خود دھی رات کی تاریکی میں شہر تک پہنچا۔ لیکن اُسے کامیابی نہ ہو سکی۔ دوسرے دن اُس کے چند آدمی آگے بڑھے۔ اور راستہ میں دُو مسلمانوں کو قتل کر دیا۔ جو اپنی اراضی میں کاشت کر رہے تھے۔ انہوں نے ان شہداء کے کھجوروں کے باغ کو بھی نذرِ آتش کر دیا آنحضرت صلعم کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپؐ نے باہر نکل کر آٹھ میل تک ابو سفیان کا تعاقب کیا۔ لیکن وُہ فرار ہو گیا۔

اس وقت نجد کا علاقہ حربی نقطۂ نظر سے مسلمانوں کے لیئے اہمیت اختیار کر رہا تھا۔ نواحِ نجد کے ایک قبیلے بنی ثعلبہ نے مدینے کو لُوٹنے کا منصوبہ بنایا۔ لیکن آنحضرت صلعم کو بر وقت اس کی خبر ہو گئی۔ اور آپؐ نے چار سو مجاہدین کے ساتھ اچانک حملہ کر کے دشمن کے منصوبہ کو درہم برہم کر دیا۔ دشمن بدحواس ہو کر بھاگا۔ اُس کا سردار عثور خفیہ حملہ کی نیت سے رُو پوش ہو گیا۔ لیکن ناکام رہا۔

بالآخر اُس نے اسلام قبول کر کے مسلمانوں کی امان حاصل کی ——— ان حالات نے نجد کے علاقہ کی اہمیت کو واضح کر کے آنحضرت صلعم کی خاص توجہ کو وہاں مرکوز کر دیا ———!

دوسری طرف مکہ کے تجارتی قافلے بدر اور ساحل کا راستہ ترک کرتے ہوئے

نجد اور عراق سے گزر کر شام جانے لگے۔ اس لیئے آنحضرت صلعم نے اس راستہ میں بھی رکاوٹ پیدا کرنے کا انتظام کیا۔ اس مقصد کے لیئے زید بن حارثہ کو حکم دیا گیا۔ کہ ابوسفیان کے قافلہ کو لوٹ لیا جائے۔ جو نجد کے ایک سردار بکر بن وائل کی حمایت اور اُس کے مقرر کردہ نائب فرات بن حیان کی رہبری اور حفاظت میں تجارتی مال لیے جا رہا تھا۔ مسلمانوں نے اس قافلہ کو گھیر لیا۔ ابوسفیان فرار ہو گیا۔ فرات بن حیان گرفتار ہوا۔ اور مسلمانوں کو ایک لاکھ درہم کی چاندی بطور مال غنیمت مل گئی ——— اس طرح نجد کا راستہ بھی قریش کے لیئے بند ہو گیا۔ جس کے باعث اُن کی تجارت کو سخت نقصان ہونے لگا۔ اور سارا شہر مکّہ معاشی بحران میں مبتلا ہو گیا۔ نیز اُن کا وقار بھی بُری طرح متاثر ہو رہا تھا۔ بدر میں وُہ ذلیل و رسوا ہوئے تھے ابوُسفیان کو دو مرتبہ راہ فرار اختیار کرنا پڑی تھی ——— اور اس طرح سارے قریش کی انتقام کی آگ بھڑکتی جا رہی تھی۔ چنانچہ انہوں نے طے کیا کہ ان تمام رکاوٹوں کو بزور شمشیر رفع کیا جائے۔ اور مسلمانوں کو پُوری قوّت سے کچل کر اُن کی مخالفتوں کا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا جائے۔ اُن کے پاس وسائل اور دولت کی کمی نہیں تھی۔ بے شمار قبائل ان کی مدد کے لیئے موجود تھے۔ اور لڑنے والے مسلح سپاہیوں کی کثیر تعداد کا جمع کیا جانا اُن کے لیئے بہت آسان تھا۔ اُنھوں نے تقریباً ڈھائی لاکھ درہم بدر کے قیدیوں کا فدیہ ادا کیا تھا۔ اب اسی قدر رقم اپنی تازہ مہم کے لیئے اُنھوں نے بسہولت فراہم کر لی۔ اور ساتھ ہی تین ہزار کا ایک مسلح لشکر بھی جمع کر لیا۔ جس میں اُن کے جنگجو "احابیش" بھی شامل تھے۔ اس لشکر میں سات سو زرہ پوش اور دوسو اسپ سوار تھے۔ انھوں نے بدر کے مقتولین کی بیواؤں اور قریبی رشتہ دار عورتوں کو رجز خوانی اور سپاہیوں کی حوصلہ افزائی کے لیئے ساتھ رکھا۔ اور ہر طرح کیل کانٹے سے لیس ہو کر ماہ شوال ۳ھ میں وُہ مدینے کی طرف روانہ ہو گئے بارہ دن سفر کر کے غابہ کے قریب اُنھوں نے اپنا پڑاؤ ڈالا۔ کیونکہ وہاں چارہ اور پانی کی افراط تھی۔ وہاں سستا کر وُہ آگے بڑھے اور جبل رواۃ کے قریب ٹھہر گئے۔

مسلمانوں کے خفیہ نگار قریش کی تیاری اور نقل و حرکت کی اطلاع سرعت سے مدینہ کو برابر دیتے رہے۔ چنانچہ آپ بھی آنے والے خطرہ کے لیے تیار ہو گئے۔

اُحد کا محلِ وقوع

مدینے کے شمال میں تقریباً ساڑھے تین میل کے فاصلہ پر ایک پہاڑ شرقاً غرباً واقع ہے۔ جو اُحد کہلاتا ہے۔ مکہ مدینے کے جنوب میں ہے۔ لیکن مدینے کے مخصوص جغرافیائی موقف کے باعث قریشِ مکہ مسلمانوں کے اس شہر کی جنوبی سمت سے حملہ نہیں کر سکے۔

مدینہ ایک میدان میں واقع ہے۔ یہ میدان تقریباً دس میل لمبا اور اسی قدر چوڑا ہے۔ اس کے چاروں طرف پہاڑوں کا سلسلہ ہے اور آمد و رفت تنگ وادیوں اور گھاٹیوں سے ہوتی ہے۔ اُس زمانہ میں مدینہ کئی چھوٹی چھوٹی آبادیوں یا محلوں پر مشتمل تھا۔ آنحضرت صلعم جس محلہ میں سکونت فرما تھے۔ وہ شہر کے درمیان واقع تھا۔ اور قریش کو دیگر محلہ والوں سے کوئی عناد بھی نہیں تھا۔ شہر کے اطراف بالخصوص جنوب اور جنوب مغرب میں باغات موجود تھے جس کے باعث اس علاقہ میں لڑائی کے لئے کوئی میدان فراہم نہیں ہو سکتا تھا جنوب سے براہِ راست مدینے کو آنے کے لیے قبا کی طرف سے ایک راستہ تھا۔ جو نہایت دشوار گزار اور لاوے کے پتھروں سے اٹا ہوا ہونے کی وجہ سے لشکرِ قریش کے لئے سخت تکلیف دہ ثابت ہو سکتا تھا۔ مشرق اور مغرب میں بھی لاوے کے میدان تھے۔ جو دھوپ میں اس قدر گرم ہو جاتے تھے۔ کہ وہاں کوئی پڑاؤ نہیں ڈالا جا سکتا تھا البتہ وادی کے اُس راستے سے گزر کر جو ذوالحلیفہ، وادی العقیق اور زغابہ سے ہوتا ہوا مدینہ جاتا تھا کاروانوں کے لئے آسان تھا۔ کیونکہ اس وادی کی ریت نرم تھی۔ اور نشیب و فراز نہ ہونے سے راہرو کو کوئی زحمت نہیں ہو سکتی تھی۔

اُحد کے پہاڑ کے درمیانی حصہ میں نیم دائرے کی شکل میں ایک وسیع میدان ہے ماس کے جنوب سے وادیِ قناۃ گزرتی ہے۔ اِس وادی کے جنوب میں جبلِ عینین واقع ہے۔ وادیٔ قناۃ کے شمال میں جبلِ اُحد کے دامن میں جو کھلا میدان ہے۔ اُسی میں پانی کے دو چشمے موجود ہیں۔

مسلمانوں کے جاسوس لشکرِ قریش میں شامل ہو گئے تھے۔ وہ آنحضرت صلعم کو حالات سے برابر آگاہ کرتے رہے۔ یہ لشکر آگے بڑھ کر جب زغابہ میں مقیم ہوا تو آپؐ نے اپنی فوج کی نقل و حرکت شروع کی۔ پہلے تو آپؐ شہر کے اندر رہی سے مدافعت کرنا چاہتے تھے، لیکن نوجوان افسروں کے مشورہ پر باہر نکل کر مقابلہ کرنے کا آپؐ نے فیصلہ کر لیا۔ مدینے سے باہر مقام شیخین پر آپؐ نے اپنے دستوں کا معائنہ فرمایا۔ چھوٹے بچوں کو واپس کر دیا۔ ضروری اشیاء فراہم کر لیں۔ عورتوں کی ایک بڑی تعداد کو مرہم پٹی کے لیے ساتھ رکھا۔ اور معاملہ کے ہر پہلو پر غور کر کے پہلے دن اُسی جگہ قیام فرمایا۔

مسلمانوں کی فوج میں سات سو سپاہی تھے جن میں سے صرف ایک سو کے پاس زرہیں تھیں۔ اور باقی ایک یا ایک سے زائد ہتھیار سے مسلح تھے۔ رات کے وقت اسلامی لشکر کی حفاظت کے لیے گشتی دستوں کو متعین کیا گیا۔ اور دوسرے روز آگے بڑھ کر جبلِ اُحد کے کھاڑ میں پڑاؤ ڈالا گیا۔ آپؐ نے فوراً اُحد کے مورچوں پر قبضہ کر کے جبلِ عینین پر پچاس تیر انداز مقرر کیے۔ تاکہ وادیٔ قناۃ کے راستے سے لشکرِ کفار حملہ کرے۔ تو اُسے روک دیا جائے۔ باقی سپاہیوں کو متعدد دستوں میں تقسیم کر کے مقابلہ کے انتظامات مکمل کر لیے گئے۔

جنگِ اُحد کے روز کفارِ مکہ کی فوج زغابہ سے احد کے جنوبی دامن تک بڑھ آئی۔ سواروں کے ایک حصہ کی کمان خالد بن ولید کر رہا تھا، یہ سوار میمنہ کے عقب میں تیار کھڑے تھے۔ عکرمہ بن ابی جہل میسرہ پر متعین تھا۔

آنحضرت صلعم ساڑھے چھ سو سپاہیوں کے ساتھ قریش کی تین ہزار جمعیت کے مقابلہ کے لیے کھڑے ہو گئے۔ ایک دستہ جبلِ اُحد کے نیچے مقرر کیا گیا، تاکہ درہ کی طرف سے حملہ نہ ہو۔ مصعبؓ بن عمیر کو علم دیا گیا۔ حضرت زبیرؓ کو رسالہ کی کمان دی گئی۔ اور اس کی حفاظت کے لیے تیر اندازوں کا ایک دستہ بھی مقرر کیا گیا۔

جنگِ اُحد اور فوجوں کا استعمال خالد بن ولید زغابہ کے شمال مشرق

سے ہوتا ہوا میدانِ اُحد کی طرف آیا۔ اُس نے بار بار آگے بڑھنے کی کوشش کی۔ مگر مُسلم تیر اندازوں کے تعاون سے حضرت زبیرؓ کا رسالہ اُسے پسپا ہونے پر مجبور کرتا رہا۔

آنحضرت صلعم نے اس جنگ میں اپنی مختصر سی فوج کا استعمال انتہائی تدبر سے کیا جس سے آپ کی فنی بصیرت پر روشنی پڑتی ہے۔ عہدِ جدید کے ماہرین جنگ کہتے ہیں۔ کہ فوجوں کے استعمال میں ذیل کے طریقے اختیار کیے جائیں :-

۱۔ سواروں کو صرف اُس وقت استعمال کیا جائے۔ جبکہ دُشمن کو ہماری پیادہ فوج اور تیر اندازوں (عہدِ حاضر میں توپ خانہ) نے کافی نقصان پہنچایا ہو۔ اور دشمن پسپا ہو رہا ہو۔

۲۔ سواروں کو پیادہ فوج سے پیچھے اس طرح رکھا جائے۔ کہ وُہ دُشمن کے تیروں (یا آتشباری) کی زد میں بھی نہ آسکیں۔ اور ضرورتاً پیادہ فوج کی امداد یا دُشمن کے تعاقب کے لیے فوراً آگے بھی بڑھ سکیں۔

۳۔ تھوڑی سی فوج سے دُشمن کو تھکا دینے کی کوشش کی جائے۔ اور باقی فوجوں کو مرکوز کر کے مناسب موقع پر ساری توانائی کے ساتھ حملہ کر دیا جائے۔

اس جنگ میں سپہ سالارِ اسلام نے جس طریقہ سے اپنے لشکر کو استعمال کیا ہے۔ اُس سے مندرجہ بالا اصُولوں کی رُوح منعکس ہوتی ہے ـــــــ عکرمہ بن ابی جہل اِس وقت آگے بڑھا۔ آنحضرت صلعم نے اپنے رسالہ کے دو حِصّے کر دیئے ایک تو حضرت زبیرؓ کے تحت اپنی جگہ قائم رہا۔ اور دوسرا جبلِ عینین کی طرف بڑھنے لگا۔ جیسا کہ اُوپر بیان کیا گیا ہے۔ حضرت زبیرؓ خالد کے حملوں کو پسپا کرتے رہے خالد نے عکرمہ کے حملے کا انتظار کیے بغیر لڑائی شروع کر دی۔ یہ اُس کی غلطی تھی۔ دراصل عکرمہ اُس دوسرے دستے کی نقل و حرکت کو دیکھ رہا تھا۔ جو جبلِ عینین کی طرف بڑھ رہا تھا ـــــــ خالد لشکرِ کفار سے بہت آگے نکل آیا تھا۔ اُس نے بالآخر ایک سخت حملہ کیا۔ لیکن دونوں طرف کے تیر اندازوں نے اس کے سواروں

کے حوصلے پست کر دیئے۔ اور ٹھیک اسی وقت آنحضرت صلعم نے حضرت زبیرؓ کو پوری قوت سے حملہ کرنے کا حکم دیا۔ اس کے ساتھ ہی دُوسرا دستہ بھی نتہ کی طرف سے خالد کے رسالہ پر حملہ آور ہُوا ——— اور خالد کا رسالہ شکست کھا کر پیچھے ہٹ گیا۔ مسلمانوں نے تکبیر کے خوف زدہ رسالے کو بھی پسپا کر دیا۔ اور تیر اندازوں نے سارے لشکر قریش کو وادیٔ قناۃ کی طرف دھکیل دیا۔ پھر لشکرِ اسلام نے عام حملہ کر دیا۔ قریش کے پڑاؤ سے عورتیں بھاگنے لگیں۔ اور مسلمان سپاہیوں نے بلا اجازت لوٹ مار شروع کر دی ——— مسلم تیر انداز بھی بلا اجازت پہاڑ سے اُتر آئے۔ اور دشمن کا تعاقب کرنے کی بجائے مالِ غنیمت حاصل کرنے کے لیے منتشر ہو گئے۔ خالد نے اس بدلی ہوئی صورتِ حال کا جائزہ لیا اور واقعات کی رفتار کو اپنے حق میں دیکھ کر وہ اپنے سواروں کو لے کر پلٹا۔ اور مسلمانوں پر پیچھے سے حملہ کر دیا۔ سات آٹھ تیر انداز پہاڑ پر باقی رہ گئے تھے۔ لیکن وہ قریشی سواروں کو روکنے میں ناکام رہے۔ خالد آگے بڑھتا چلا گیا۔ اور اُسے دیکھ کر قریش کا پسپا ہونے والا باقی لشکر بھی میدان کی طرف لوٹ آیا۔ مسلمان اب دونوں طرف سے گھِر گئے اور سخت انتشار کی حالت میں شکست کھا کر مدینے کی طرف فرار ہونے لگے۔

آنحضرت صلعم کے اطراف چند جاں نثار موجود تھے۔ آپؐ انہیں لے کر پہاڑ پر چڑھ گئے۔ اور ایک مورچہ بنا کر دشمن پر سنگباری کرنے لگے۔ جو آپؐ کو قتل کرنے کے لیے بار بار چڑھ آ رہا تھا۔ پتھر کی ضرب سے کچھ دندانِ مبارک شہید ہو گئے! اور آپؐ ایک گڑھے میں گر پڑے۔ اس پر آپؐ کی شہادت کی افواہ پھیل گئی۔ مسلمانوں کے اوسان خطا ہو گئے۔ میدان مجاہدین سے خالی ہو گیا۔ اور دشمن اپنے پڑاؤ کی طرف لوٹ گیا اس کے بعد بچے کھچے مسلمان آنحضرتؐ کے پاس جمع ہُوئے۔ جن کو دیکھ کر دشمن کے ایک مختصر دستے نے پھر حملہ کر دیا۔ لیکن مسلمانوں کی سنگباری کی وہ تاب نہ لا سکا ابوسفیان خود بھی ایک دستے کے ساتھ آنحضرت صلعم کے قتل کی خبر کی توثیق کے لیے پہاڑ کی طرف آیا۔ مگر جب اُسے یہ معلوم ہُوا کہ آپؐ زندہ ہیں۔ اور اپنے دستوں کو برابر بڑھا رہے

ہیں۔ تو اُس نے مناسب یہی سمجھا کہ مزید کسی لڑائی کے بغیر لوٹ جائے۔ تا کہ جنگ کی فتح کا سہرا اُسی کے سر رہے۔ واپس ہوتے ہوئے اُس نے مسلمانوں سے کہا کہ آئندہ سال بدر میں پھر ایک مرتبہ مقابلہ کیا جائے گا۔ مسلمانوں نے اس چیلنج کو قبول کر لیا ـــــ اس وقت جنگ کا نقشہ بدل رہا تھا۔ کفار اپنے مقتول سپاہیوں کی نعشیں چھوڑ کر پڑاؤ کی طرف ہٹ رہے تھے۔ اور منتشر مسلمان سپاہی آنحضرت صلعم کی شجاعت اور دانشمندی کی بدولت اسلامی جھنڈے کے نیچے جمع ہوتے جا رہے تھے

دُشمن جب میدان سے ہٹ گیا۔ تو آنحضرت صلعم نے سوچا۔ کہ کہیں شہر مدینہ پر حملہ نہ ہو جائے۔ چنانچہ آپ نے حضرت علیؓ کو دُشمن کی نقل و حرکت کی اطلاع حاصل کرنے کے لیے بھیجا ـــــ حضرت علیؓ نے واپس ہو کر بتایا کہ دُشمن اونٹوں پر سوار ہے اور گھوڑوں کو کوتل کر کے روانہ ہو گیا ہے۔ تو آپ سمجھ گئے کہ مدینے پر حملے کا امکان نہیں ہے۔ کیونکہ صرف طویل سفر ہی کے لیئے گھوڑوں کو کوتل کیا جاتا ہے۔

اس کے بعد آپ نے تمام نعشوں کو دفن کرایا۔ اور دُشمن کی نعشوں کی بے حرمتی کو ممنوع قرار دیا۔ حالانکہ دُشمن نے اکثر شہداء کی نعشوں کے ساتھ سخت نازیبا حرکتیں کی تھیں۔

آپ احتیاطاً دُشمن کے قافلے کے پیچھے پیچھے روانہ ہُوئے تاکہ اگر وُہ اپنی غلطی پر نادم ہو کر پلٹ جائے اور مدینے پر حملہ کر دے۔ تو اُس کی مزاحمت کی جا سکے لیکن جب اس نے آٹھ دس میل کی مسافت طے کر لی۔ تو آپ مطمئن ہو گئے اور کافی دیر تک راستہ میں قیام کر کے مدینے لوٹ آئے۔

جنگِ اُحد کے نمایاں پہلو

اس جنگ کا نقشہ تیزی سے بدلتا رہا۔ پہلے لشکرِ کفار کے قدم اُکھڑ گئے۔ لیکن تھوڑی ہی دیر میں پانسہ پلٹ گیا۔ اور مسلمان فوج منتشر ہو گئی۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے سپہ سالارِ مدینہ کے تدبر اور شجاعت نے صورتِ حالات کو بدل دیا۔ منتشر مجاہد جمع ہونے گئے۔ کفار میدان چھوڑ کر چلے گئے۔ اور ان کی جیتی ہُوئی بازی اُلٹ گئی۔ اس جنگ میں مسلمانوں کی ہزیمت کے

وہ اسباب تھے :-

۱- پہلے دور میں لشکر کفار جب پسپا ہونے لگا۔ تو مسلمانوں نے ان کا تعاقب نہیں کیا۔ بلکہ لوٹ کھسوٹ میں مصروف ہو گئے۔

۲- مسلم تیر انداز سپہ سالار کی واضح ہدایات کے خلاف پہاڑی سے نیچے اتر آئے۔ جس کے سبب سے خالد کو موقع مل گیا۔ کہ اپنے پسپا ہونے والے لشکر کو جمع کر کے منتشر مسلمانوں پر حملہ کر دے۔ لیکن اس شکست کے اثرات کو سرکار مدینہ کی حربی مہارت نے زائل کر دیا۔ اور کفار مکہ کو مراجعت ہی میں مصلحت نظر آئی۔

اس معرکہ نے اس حقیقت پر ایک اور مہر تصدیق لگادی کہ محض وسائل کی افراط جنگ جیتنے کے لیئے کافی نہیں ہے۔ بلکہ سپہ سالار کی شخصیت، سپاہیوں کی اعلیٰ صلاحیت اور لشکر کی بہتر اخلاقی حالت کے ذریعے وسائل کی بہتات کو غیر موثر کر دیا جا سکتا ہے۔ میدان احد میں جنگ کے ان اجزائے ترکیبی کا سرسری جائزہ لیا جائے۔ تو حسب ذیل امور کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے :-

۱- سپہ سالار اسلام کی شخصیت، حربی مہارت اور اس کا آہنی عزم :-

(ا) آپ کی شخصیت نے نازک حالات میں مقناطیس کا کام کیا۔ منتشر ہونے والے مسلمان سپاہیوں کو جب معلوم ہوا۔ کہ آپ زندہ ہیں۔ اور دشمن کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ تو وہ یکے بعد دیگرے آپ کے اطراف جمع ہوتے گئے حتیٰ کہ ابوسفیان نے جنگ کے نقشہ کو بدلتا ہوا دیکھ کر مصلحت اسی میں سمجھی کہ اپنے شہر لوٹ جائے۔ تاکہ فتح کا سہرا اس کے سر برقرار رہے۔

(ب) آپ زخمی ہو گئے اور دندان مبارک شہید ہو گئے۔ لیکن آپ نے ہمت نہیں ہاری اور نہ امان طلب کی، بلکہ سپاہیوں کو جمع کر کے بدستور دشمن کی مزاحمت کرتے رہے۔ یہاں تک کہ یہ مزاحمت بتدریج تقویت حاصل کرتی گئی اور بالآخر دشمن کو میدان چھوڑنے پر مجبور ہونا پڑا۔

جنگوں میں بالعموم مادی وسائل اور اخلاقی عناصر کے ذریعے فتح حاصل کرنے کی

کوشش کی جاتی ہے۔ لیکن ایسا اوقات فتح کا کوئی امکان نہ ہونے کے باوجود ہمیں اپنی مساعی جاری رکھنی پڑتی ہیں۔ اور ہمت ہارنے کی بجائے "آہنی عزم" کے ساتھ آگے بڑھنا پڑتا ہے۔ اس لیے شکست کے شدید اندیشے کی موجودگی میں بھی اپنی مہم کو ناممکن نہیں سمجھنا چاہیئے۔ بلکہ ہمت اور موجودہ وسائل سے آخر وقت تک کام لینا چاہیئے۔ آنحضرت صلعم نے بھی اس جنگ میں سکون اور استقلال کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ کفارِ مکہ اپنی فتح مندی کے باوجود کوئی فائدہ نہ اُٹھا سکے۔

احد: آپ نے بہترین مورچہ بندی کی اور زمین کا نہایت مناسب استعمال کیا ابوسفیان نے منصوبہ بنایا تھا۔ کہ جبل اُحد کو اپنی فوج کی پشت پر رکھ کر مسلمانوں سے مقابلہ کیا جائے۔ لیکن آنحضرت صلعم کو خفیہ نگاروں کے ذریعے تمام اطلاعات مل رہی تھیں۔ اس لیے آپ نے راتوں رات مسافت طے کر کے اُحد کے ایک ایسے حصہ پر اپنا مورچہ بنا لیا۔ جو فنِ لشکر کشی strategy کے اعتبار سے اہم ترین تھا۔ یہ مقام دُشمن کے محفوظ مقام غابہ اور اُس کے لشکر کے درمیان تھا۔ تیر اندازوں کو ایک ایسی جگہ متعین کیا۔ جہاں سے نہ صرف دُشمن کے تازہ حملوں کی مدافعت ہی ہو سکتی تھی۔ بلکہ جنگ کے دوران میں اقدام کرنے والے مسلمان دستوں کی اعانت بھی ممکن تھی ——— درحقیقت پہاڑ کے صحیح استعمال کے لیئے بڑی حربی بصیرت کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیونکہ شکست کی صورت میں یہی پہاڑ سخت مشکلات کا بھی باعث ہو جاتے ہیں۔ آنحضرت صلعم نے کمال دانشمندی سے ایسے موزوں مقام کا انتخاب کیا۔ کہ دشمن آپ کی مرضی کے مطابق نقل و حرکت کرنے اور لڑنے پر مجبور ہو گیا۔! جب مسلمانوں کے قدم میدان سے اُکھڑ گئے۔ تو آپ نے اپنی بصیرت کا ایک اور ثبوت فراہم کیا۔ وہ یہ کہ پسپا ہونے یا راہِ فرار اختیار کرنے کی بجائے آپ پہاڑ پر چڑھ گئے اور ایک مورچہ بنا کر اُس میں محفوظ ہو گئے۔ وہاں سے آپ کے ساتھیوں نے سنگباری شروع کی۔ اور بڑھتے ہوئے دُشمن کو روک دیا۔

(د) نپولین کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وُہ اپنے سپاہیوں کی سنگینوں سے زیادہ اُن کی ٹانگوں سے کام لیتا تھا۔ یعنی سپاہیوں کی نقل وحرکت وُہ بہت تیزی سے کراتا تھا۔ اور مناسب مقام پر دُشمن سے پہلے پہنچ جاتا تھا۔ درحقیقت جنگ میں "وقت" کی اہمیت "محل وقوع" کی اہمیت سے کچھ کم نہیں ہوتی۔ کیونکہ جس فریق کی فوجیں مناسب مقام پر پہلے پہنچ جاتی ہیں اُس کے مورچے کو فوقیت حاصل ہو جاتی ہے ——— آنحضرت صلعم کی فوجوں نے پھرتی سے سفر طے کر کے اُحد کی پہاڑی پر قبضہ کر لیا۔ اور دُشمن کے منصوبہ کو ناکام کر دیا۔

میدانِ جنگ میں بھی آپؐ کے دستے برق کی دوش پر سوار ہو کر اس طرح نقل و حرکت کرتے رہے کہ دُشمن آپؐ کے منصوبہ کو سمجھنے سے قاصر رہ گیا۔

(ہ) درّے کے پانی کے چشموں پر آپؐ نے دُشمن کے پہنچنے سے پہلے قبضہ کر لیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوُا۔ کہ دُشمن کے سپاہیوں کی کثیر تعداد لشکر اور جانوروں کیلئے دُور سے پانی کی فراہمی میں مصروف ہو گئی اور اس طرح اُس کی عددی برتری بڑی حد تک متأثر ہو گئی ——— پسپا ہونے کے بعد مُسلمان جب دوبارہ آنحضرت صلعم کے اطراف جمع ہونے لگے۔ تو کفارِ مکّہ نے مکرّر شمشیر آزمائی سے اس وجہ سے بھی گریز کیا۔ کہ پانی اور چارہ کی قلت کے باعث وُہ اور اُن کے جانور نڈھال ہو گئے تھے۔

(و) آپؐ نے فوری اور غیر متوقع ضروریات کے لیئے محفوظ دستے علیٰحدہ رکھے تھے

(ز) آپؐ نے اپنا منصوبۂ جنگ نہایت سادہ بنایا تھا۔ چنانچہ جب مسلمان سپاہی منتشر ہونے لگے۔ تو آپؐ نے اس منصوبہ کو آسانی سے بدل دیا۔ اور ایک جُداگانہ دفاعی صورت اختیار کی۔

(ح) آپؐ کی کامیاب حربی چالوں ہی کا نتیجہ تھا کہ خالد اور عکرمہ کے بھاری دستے پسپا ہو گئے تھے۔

۲۔ **لشکرِ اسلام کی اخلاقی حالت:** نازک ترین لمحات میں بھی مجاہدین کی اخلاقی

حالت استوار رہی۔ یہ صحیح ہے۔ کہ دشمن کی پسپائی پر اُس کا تعاقب کرنے کی بجائے اُنھوں نے لوٹ مار شروع کر دی اور تیر انداز بھی بغیر اجازت نیچے اُتر آئے۔ لیکن اس غلطی کے قطع نظر دیکھیے تو اُن کی شجاعت اور حوصلہ مندی میں کوئی شبہ نہیں پیدا ہو سکتا۔ دشمن کے زبردست رسالے کا اُن کے پاس کوئی مناسب جواب نہیں تھا ہتھیار اُن کے پاس کم تھے۔ اور زرہیں صرف ایک قلیل تعداد کو نصیب ہو سکی تھیں لیکن چوگنی فوج کے مقابلہ میں وہ آہنی دیوار کی طرح ڈٹ گئے تھے۔ خدا اور اُس کے رسولؐ کی محبت سے اُن کے عزائم مستحکم اور دل طاقتور ہو گئے تھے۔ اور شوقِ شہادت اُن کے خیالات میں اس طرح بس گیا تھا۔ کہ موت کا کوئی تصور اُن کے پاس موجود ہی نہیں تھا۔ وہ نہایت بے جگری سے لڑ رہے تھے، آگے بڑھ رہے تھے، زخمی ہو رہے تھے، شہید ہو کر زمین پر گر رہے تھے، لیکن اُن کا نصب العین اپنی اعلیٰ ترین بلندی پر قائم رہا۔ اور اُن کا جھنڈا کسی وقت بھی سرنگوں نہیں ہونے پایا ——— !

اور جب دشمن کو غلبہ حاصل ہو گیا۔ تو عدول حکمی پر وہ نادم ہوئے۔ اور اس غلطی کا ازالہ اور نقصان کی تلافی کا جذبہ اُن میں اس طرح پیدا ہوا۔ کہ آن کی آن میں سرورِ کائنات کے پاس وہ جمع ہو گئے۔ اور پریشانیوں اور ہلاکت خیزیوں میں اپنی ساری توانائیوں کے ساتھ لڑنے لگے۔ مسلمان عورتوں نے بھی اس جنگ میں اپنی شجاعت اور جاں نثاری کے جوہر دکھائے۔ خود حضرت عائشہؓ زخمیوں کو پانی پلاتی رہیں۔ اور دیگر خواتین اُن کی مرہم پٹی کرتی رہیں۔

تاریخ کی چند جنگیں

گذشتہ اوراق میں کسی جگہ ہم نے تاریخ کی چند اہم جنگوں سے جنگِ بدر کا مقابلہ کیا ہے۔ ان ہی جنگوں سے جنگِ اُحد کا بھی یہاں موازنہ کیا جاتا ہے :-

۱۔ جنگِ خادلیش ۲۸۸ قم : جیسا کہ بیان کیا گیا ہے[1]۔ رمیس کی غلطی سے عمان کے کیمپ کا سقوط ہو گیا۔ لیکن حتیوں نے رمیس کا تعاقب کرنے کی بجائے کیمپ کو لوٹنا شروع کر دیا۔ رمیس کیمپ کے باہر نکل چکا تھا۔ اُس نے اس موقع

[1] ملاحظہ ہوں صفحات ۱۰۰ تا ۱۰۲۔

سے فائدہ اُٹھا کر منتشر سپاہیوں کو از سر نو جمع کیا۔ اور رقیبوں پر پے در پے حملے شروع کر دیئے۔ ساتھ ہی جنوبی جنگل سے اُس کی فوجیں پہنچ آئیں حتیٰ فوجیں دونوں طرف سے گھر گئیں۔ اور اس طرح اُن کی فتح شکست میں بدل گئی ——!

جنگِ اُحد میں بھی تقریباً ایسی ہی صورت پیش آئی۔ مسلمان اپنے دشمن کا تعاقب کرنے کی بجائے لوٹ کھسوٹ میں مصروف ہو گئے۔ اور رمیس کی طرح خالد نے حالات کو اپنے موافق دیکھ کر پسپا ہونے والے سپاہیوں کو جمع کیا۔ اور مسلمانوں پر پے در پے حملے شروع کیئے۔ عکرمہ کے دستے بھی لوٹ آئے۔ نتیجتاً دونوں طرف سے مُسلمان گھر گئے اور خالد اور عکرمہ کے سخت حملوں کی تاب نہ لا کر پیچھے ہٹنے لگے۔

جنگِ خادیش میں حتیٰ بادشاہ اور رمیس دونوں نے غلطیاں کی تھیں۔ حتیٰ بادشاہ کے رن گاڑوں کو اُس کی پیادہ فوج کا تعاون حاصل نہیں تھا۔ نیز اُس نے مناسب مقام پر اس فوج کو مجتمع نہیں کیا تھا۔ اور نہ پسپا ہونے والی دُشمن کی فوجوں کا تعاقب کیا تھا۔ رمیس نے جاسوسی کا انتظام ٹھیک طرح نہیں کیا تھا جس کے باعث اُس کی فوجیں منتشر رہیں۔ اور ایسے مقام پر اُسے جنگ کرنی پڑی۔ جو اُس کے لئے تکلیف دہ ثابت ہُوئی۔ تعاون کے اصُول کو بھی اُس نے نظر انداز کر دیا تھا۔ اور اپنی بڑی فوج کو پیچھے چھوڑ کر آگے نِکل گیا تھا۔

اس کے برعکس آنحضرت صلعم کی فوجوں میں مکمل تعاون موجُود تھا۔ آپؐ نے جس ترتیب سے اپنی مختصر فوج کو متعین فرمایا تھا۔ اس کا لازمی نتیجہ باہمی تعاون اور ہم آہنگی تھا۔ نیز آپؐ نے مناسب موقع پر مناسب تعداد میں سپاہیوں کو مجتمع کیا تھا۔ جس کی بدولت خالد اور عکرمہ کے دستوں کے حوصلے پست ہو گئے۔ رمیس کی فوجوں کے برعکس آپؐ کی فوجیں ایک مکمل تنظیم کے تحت میدانِ جنگ میں آئی تھیں۔ اور ایسے مقام پر قابض ہو گئیں تھیں۔ جو حربی نقطۂ نگاہ سے انتہائی مفید ثابت ہو سکتا تھا۔

آپؐ کو رمیس پر مزید دو وجوہ سے فوقیت حاصل ہے۔ پہلے تو یہ کہ

رمیس کے برعکس آپ کی جاسوسی کا انتظام مکمل تھا۔ اور دشمن کی ہر حرکت کی اطلاع آپ کو پہنچ رہی تھی۔ اور دوسرے یہ کہ رمیس کو آپ کی طرح اپنے سے چوگنی قوت کا مقابلہ نہیں کرنا پڑا تھا۔

۲۔ جنگ اربیلا ۳۳۱ ق۔م: جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے[لہ]۔ سکندر اعظم کی یہ جنگ حربی مہارت کا عجیب و غریب نمونہ ہے۔ اس کی تفصیلات اوپر آگئی ہیں۔ یہاں صرف اس قدر صراحت مطلوب ہے۔ کہ جنگ احد میں آنحضرت صلعم نے جس فنی مہارت کا مظاہرہ فرمایا ہے۔ اس سے سکندر کی تابناک شخصیت بھی دھندلکے میں آجاتی ہے۔

سکندر کی افواج کو اس کی ذات پر اعتماد تھا۔ اس نے اطلاعات کا مکمل انتظام کر رکھا تھا۔ میدان کارزار کا وہ بغور مطالعہ کر رہا تھا۔ اس نے اپنی قوت کا محتاط استعمال کیا تھا۔ اس کی فوجوں کی حرکت پذیری اس کی کامیابی کا ایک بڑا سبب تھی۔ اور اس کی صف بندی نے دارا کی قوت کو ناکام کر دیا تھا ——! آنحضرت صلعم کو مسلمان سپاہیوں کا جو مکمل اعتماد حاصل تھا۔ اس کا اندازہ مشکل ہے۔ تاہم بلا خوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ دنیا میں آج تک ایک بھی شخصیت ایسی پیدا نہیں ہوئی جس پر اس کے حامیوں نے اتنا بھروسہ کیا ہو جتنا کہ مسلمانوں نے موت اور حیات کی کشمکش میں اپنے رسولؐ پر کیا تھا۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے۔ جنگ احد میں اطلاعات کا آپ نے پورا پورا بندوبست کر لیا تھا۔ اور آپ کی تیز نگاہیں میدان کارزار پر مرکوز تھیں۔ دشمن کی ہر حرکت اور اقدام کو آپ دیکھتے اور اس کا جواب تجویز فرماتے رہے۔ آپ نے اپنی فوجوں کو اندھا دھند میدان میں نہیں جھونکا۔ بلکہ ضرورت کے مطابق اپنے دستوں کی تقسیم کر کے دشمن کے جواب کے لیئے روانہ کیا۔ مدینے سے جبل احد تک آپ کی ساری فوجیں نہایت تیزی سے پہنچیں۔ اور میدان میں اس طرح پھرتی سے حرکت کرتی رہیں۔ کہ خالد اور عکرمہ جیسے ماہرین حرب بھی چکرا گئے۔ صف بندی

لہ: ملاحظہ ہوں صفحات ۱۰۳ تا ۱۰۶

اور مناسب مقامات پر تیر اندازوں، سواروں، پیادوں اور محفوظ دستوں کی تعیناتی بھی قریش کے حملوں کو ناکام کرنے کا سبب ہوئی ہے —— نیز جنگِ اُحد کے مزید دو عناصر ایسے ہیں جن کی بناء پر ہم کہہ سکتے ہیں۔ کہ فنی اعتبار سے آنحضرت صلعم کو سکندرِ اعظم پر فوقیت حاصل تھی۔ ایک تو یہ کہ آپ نے سکندر کے برعکس اپنے سے چار گنا زیادہ قوت کا مقابلہ کیا۔ اور دوسرے یہ کہ شکست ہونے کے بعد بھی اس شکست کے اثرات کو زائل کر کے اپنی فوجوں کو میدانِ جنگ میں ازسرِنو اس طرح مرکوز کیا کہ دشمن کو فتحیاب ہونے کے باوجود میدان چھوڑنے کے سوا کوئی چارۂ کار باقی نہیں رہا۔

۳۔ جنگِ ٹریبیا ۲۱۸ قم[1]: اوپر بیان کیا گیا ہے۔ کہ اس جنگ میں ہنی بال نے رومیوں کو ایسی جگہ صف آرائی پر مجبور کیا تھا۔ جو اُن کے لیے ناموزوں تھی۔ نیز اُس کی جنگی چالوں کے باعث رُومی لشکر دریا کو عبور کر کے مقابلہ کے لیے نکل آیا تھا —— آنحضرت صلعم نے بھی اپنے تدبر سے کفارِ مکہ کو ایسی جگہ صف آراء ہونے پر مجبور کیا جہاں سے اقدام کرنا اُن کے لیے مشکل تھا۔ کیونکہ جب کبھی وُہ آگے بڑھنے کی کوشش کرتے، تو مسلم تیر انداز اُن کے چھکے چھڑا دیتے اور مسلم لشکر انہیں پیچھے دھکیل دیتا۔ نیز رومیوں کی طرح کفارِ مکہ بھی میدان میں پہنچنے تک تھک گئے تھے۔ اور وہاں پانی اور رسد کی عدم فراہمی سے وُہ اور اُن کے جانور بھوکے اور پیاسے ہو گئے تھے —— لیکن ہنی بال کو آنحضرت صلعم کی طرح چوگنی سے زیادہ فوج کا مقابلہ کرنا نہیں تھا۔ اور نہ ہزیمت خوردہ فوج کو ازسرِنو اپنے جھنڈے تلے جمع کر کے دُشمن کو کسی طرح میدان سے نکال دینے کا مشکل فرض اُس پر عاید ہُوا تھا۔

۴۔ جنگِ ریمی لائیس ۱۷۰۶ء[2]: پچھلے صفحات پر بیان کیا گیا ہے۔ کہ اس جنگ میں مارل بارو نے اپنی اعلیٰ فنی مہارت کی بدولت کامیابی حاصل کی تھی۔ اُس نے زمین کا بہترین انتخاب کیا تھا۔ اور ٹیلے کی بلندی اور چھوٹی ندی کے

---

[1]: ملاحظہ ہوں صفحات ۱۰۶ تا ۱۰۹ [2] ملاحظہ ہوں صفحات ۱۰۹ تا ۱۱۲

نشیب سے فائدہ اُٹھایا تھا ـــــــــ آنحضرت صلعم نے بھی زمین کا بہترین انتخاب کیا تھا۔ اور پہاڑی پر تیر اندازوں کو مقرر کر کے میدان جنگ میں فوقیت حاصل کی تھی ـــــ!

جنگِ اُحد اور جنگِ ریمی لائیس میں ایک اہم پہلو مشترک ہے جسے فوجوں کی نقل و حرکت کہا جاسکتا ہے۔ مال بارد نے پہلے اپنے میمنہ کو آگے بڑھایا۔ فرانسیسی سالار نے اس کے مقابلہ کے لیے اپنے قلبِ لشکر سے بہت بڑی فوج اپنے میسرہ پر منتقل کی۔ اس کی وجہ سے قلب لشکر میں خلاء پیدا ہو گیا جس سے مارل بارو کا مقصد پورا ہو گیا۔ چنانچہ اُس نے پوری قوت کے ساتھ حملہ کیا۔ اور بالآخر فتح حاصل کی ـــــ ایسی ہی صورت جنگ احد میں بھی پیش آئی تھی۔ اور جنگِ ریمی لائیس سے صدیوں پہلے آنحضرت صلعم نے فوجوں کی نقل و حرکت کے فن میں اپنی مہارت اور برتری کو ثابت کر دیا تھا۔

میدانِ اُحد میں جب فریقین کی فوجیں صف آرا ہو گئیں۔ تو آپؐ نے اپنے لشکر کے دو حصے کر دیئے۔ اور ایک حصّہ کو جبلِ عینیں کی طرف بڑھنے کا حکم دیا۔ اس چال کو عکرمہ سمجھ نہیں سکا اور ایک جگہ کھڑا ہو کر مسلمانوں کے دوسرے دستے کی نقل و حرکت کا مطالعہ کرتا رہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خالد کا رسالہ نرغے میں آگیا۔ اور سارے لشکرِ قریش کو پیچھے ہٹ جانا پڑا۔

لیکن جنگِ ریمی لائیس اور جنگِ اُحد میں سب سے بڑا فرق یہ ہے۔ کہ مارل بارو کو ہتھیار، سپاہی اور وسائل کی کمی نہیں تھی۔ درآنحالیکہ آنحضرت صلعم کے پاس بہت تھوڑے سپاہی تھے۔ جو مختصر اسلحہ اور محدود وسائل کے ساتھ کفار کے عظیم الشان مسلح لشکر کا مقابلہ کر رہے تھے۔

جنگِ خندق

اسباب

جنگِ احد میں مسلمانوں کی ہزیمت سے دشمن عناصر کی ہمت افزائی ہوئی۔ مخالفتیں اُبھریں۔ اور مشرق میں نجد اور شمال میں دومتہ الجندل تک مُسلمانوں کے اثرات زائل ہونے لگے۔ اندرونی الجھنوں میں اضافہ ہوا۔ قوم کے دل و دماغ پر شکست کے اثرات نمایاں ہوئے۔ بیرونی علاقوں میں مسلمانوں کے وقار کو صدمہ پہنچا۔ خطرات کی مدافعت کے لیے وسائل کا استحکام باقی نہیں رہا۔

یہودیوں کی جلاوطنی سے نت نئی مشکلات پیدا ہوتی گئیں۔ یہ لوگ مدینے سے نکل کر شمالی علاقے میں پھیل گئے۔ اور مدینے آنے والے قافلوں کو دومتہ الجندل میں لوٹنے لگے تاکہ مسلمانوں کی غلہ کی تجارت کو نقصان پہنچے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے نجد کے قبائل کو بھی آنحضرت صلعم کے خلاف اُبھارنا شروع کیا۔ چنانچہ غطفان کے چند قبیلے دولت کی لالچ میں مدینے جانے والے قافلوں کو لوٹنے کے لیے تیار ہو گیے۔

آنحضرت صلعم نجد کے اُبھرتے ہوئے فتنہ کے قلع قمع کے لیے ایک لشکر لے کر نخل پہنچے۔ اس وقت ایک قریشی قافلہ شام سے مکے جا رہا تھا لیکن آپ کے نخل پہنچنے سے پہلے وُہ بہت دُور نکل چکا تھا۔ اُسی وقت آپ کو اطلاع ملی کہ ابوسفیان ایک لشکر کے ساتھ بدر کی طرف بڑھ رہا ہے۔ آپ نے چند روز نخل میں قیام فرمایا۔ اس سے غطفان کے قبیلوں کے حوصلے پست ہو گئے۔ اور انہوں نے مسلمانوں سے چھیڑ چھاڑ کا ارادہ ترک کر دیا۔ پھر آپ نے مدینے لوٹ کر کچھ سرفروشوں کو مکے روانہ کیا۔ تاکہ وہاں کے حالات سے آگاہی حاصل ہو۔ اور وہاں دہشت پھیلا کر نظم و ضبط کو بھی متاثر کیا جائے۔

ابوسفیان نے اپنے الٹی میٹم کے مطابق جنگ کی زبردست تیاریاں کیں۔ مختلف

قبائل کو یکجے میں جمع کیا۔ اور انہیں بہترین ہتھیار فراہم کیے۔ اور اس طرح ایک لشکرِ جرّار لے کر وہ مرانظہران کی نواح میں مجنّہ تک بڑھ آیا۔ وہاں جب اُسے معلوم ہوا کہ آنحضرت صلعم اس کے مقابلہ کے لیے پوری طرح تیار ہیں۔ تو اس نے مسلمانوں کو مرعوب کرنے کی غرض سے ایک شخص کو مدینے بھیجا۔ تاکہ مبالغہ آمیز خبروں سے وہاں وہشت پھیلائی جائے ــــــ لیکن ابوسفیان کو اپنے منصوبہ میں کامیابی نہیں ہوئی۔ اس کے برعکس آنحضرت صلعم نے جہاد کا اعلان کر دیا۔ اور مسلمانوں میں خود اعتمادی پیدا کرنے اور ان کی اخلاقی حالت کو استوار کرنے کے لیے حکم دیا۔ کہ ہر سپاہی اپنا سامانِ تجارت بھی ساتھ لے چلے۔ تاکہ بدر کی منڈی میں تجارت کی جا سکے ــــــ آپ بدر پہنچ گئے۔ اور وہاں آٹھ روز تک قیام کیا مسلمانوں کا سامان بڑی قیمت پر فروخت ہوا۔ کیونکہ اس علاقہ میں قحط پڑا ہوا تھا۔

اس مہم کا اثر ابوسفیان پر سردارِ مدینہ کے اندازہ کے مطابق ہوا۔ مسلمانوں کی اس خود اعتمادی سے وہ مرعوب ہوا۔ اور آگے بڑھنے کی بجائے مکے لوٹ گیا۔

غطفان اور بدر کی مہموں سے مجاہدین کے حوصلے بلند ہو گئے۔ مشرکین کے منصوبے ناکام ہو گئے۔ اور اُن کے حلیفوں کے دل میں شبہات اور شکوک پیدا ہوتے چلے گئے۔ ابھرتی ہوئی مخالفتیں پھر اپنا سر چھپانے لگیں۔ اور سرکارِ مدینہ کی جرأت اور بصیرت سے مسلمانوں کا کھویا ہوا وقار پھر قائم ہو گیا۔

جنگِ اُحد کے بعد قریش نے دو زبردست غلطیاں کی تھیں۔ ایک تو یہ کہ مدینے پر اپنا قابو رکھنے کے لیے انہوں نے کوئی فوجی دستہ متعین نہیں کیا تھا۔ اور دوسرے یہ کہ اپنے شامی کاروانوں کے راستوں کی مستقل حفاظت کا انہوں نے کوئی بندوبست نہیں کیا تھا۔ دشمن کی ان غلطیوں سے آنحضرت صلعم نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ اور قلیل عرصہ میں ایک طرف نجد اور دوسری طرف دومۃ الجندل تک اپنے اثرات بحال کر لیے جس کے سبب سے قریشی کاروانوں کی شام، مصر، اور عراق سے آمد و رفت پھر خطرہ میں پڑ گئی۔

مسلمانوں کا بڑھتا ہوا اثر و نفوذ قریشِ مکہ کے لیے بہت بڑا خطرہ تھا۔ اُنہوں نے محسوس کیا۔ کہ اگر اس وقت اس خطرہ کا انسداد نہیں کیا گیا۔ تو مسلمانوں کا سیلاب پھر

شئے کو خس و خاشاک کی طرح بہا لے جائے گا۔ اور پھر اہلِ مکہ کے پنپنے کی کوئی صورت باقی نہیں رہے گی۔ یہودیوں کو بھی اپنا مستقبل تاریک نظر آ رہا تھا۔ انہوں نے سوچا کہ مسلمان اُن کی فتنہ پردازیوں اور بدعہدیوں کو کبھی معاف نہیں کریں گے۔ بلکہ ان کے وجود ہی کو پوری طرح مٹا دیں گے ——— لہذا یہودیوں اور کفارِ مکہ میں عہد و پیمان ہوئے۔ اور ہر بات پر وہ متحد و متفق ہو گئے۔ اس اتحاد کو معرضِ وجود میں لانے کے لیئے مدینے سے نکالے ہوئے یہود بنو النضیر نے اپنا سارا زور لگا یا تھا۔ یہ لوگ اپنی تمام دولت کے ساتھ شمالی علاقہ میں جا بسے تھے۔ اور ہمسایہ قبائل کو بڑے بڑے معاوضے دے کر مسلمانوں کے خلاف لڑنے کے لیئے آمادہ کر چکے تھے۔ غطفان کو انہوں نے خیبر کا ایک سال کا کھجور دیا تھا۔ اور اسی طرح قریش نے متعدد جنگجو قبائل اور احابیش کو مالِ غنیمت کا لالچ دے کر اپنے ساتھ کر لیا تھا۔ سنہ ۵ھ میں یہ متحدہ لشکر مدینے کی طرف روانہ ہو گیا

دفاع

جنگِ خندق ایک دفاعی جنگ تھی۔ سیاسی اعتبار سے دفاعی جنگ مُلک کی آزادی کے لیئے کی جاتی ہے۔ بلحاظِ فن اس سے مراد ایسی لڑائی ہے۔ جس میں ہم ایسے مَیدانِ جنگ میں مقابلہ پر اکتفا کرتے ہیں۔ جو ہم پہلے ہی سے تیار کر لیتے ہیں۔ اس مَیدان میں جنگ کے دفاعی یا اقدامی ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

دشمن کے قوی ہونے کی صُورت میں دفاعی جنگ لڑی جاتی ہے۔ ایسی حالت میں قلعے اور خندقیں بہت مُفید ثابت ہوتے ہیں۔ زمین کے استعمال کے بہتر طریقوں سے اور نقشوں کی فراہمی سے دفاع کی افادیت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس طرح ایک چھوٹی فوج کسی بڑی فوج کا مقابلہ کر سکتی ہے۔

ذیل کی صورتوں میں بھی دفاعی جنگ ضروری ہوتی ہے :-

(ا) جبکہ لڑائی کا علاقہ ایسے علاقوں سے گھرا ہوُا ہو۔ جہاں رسد کی قلت ہو۔

(ب) جبکہ دشمن کی صلاحیتیں بہتر ہوں۔

دفاع کی صُورت میں حسبِ ذیل امُور اہمیت رکھتے ہیں :-

ا۔ فوجوں کو حتی الامکان پوشیدہ رکھا جائے۔

۲۔ تمام فوجوں کو ایک ہی دم میدانِ جنگ میں نہ جھونک دیا جائے، کیونکہ محفوظ افواج ہی کے ذریعے جنگ کے رُخ کو پھیرا جا سکتا ہے۔

۳۔ محاذ کی لمبائی کو زیادہ اہمیت نہ دی جائے۔ محاذ جتنا طویل ہوگا۔ اُتنا ہی آراستگی (FORMATION) کی گہرائی کم ہو جائے گی۔ جو فوجیں عقب میں رہتی ہیں۔ اُن سے ہمیشہ مدد لی جاسکتی ہے۔

۴۔ ٹوکر کہتا ہے کہ کوئی دفاعی خط اُس وقت تک قائم نہیں رہ سکتا۔ جب تک کہ ہماری متحرک فوج کے متعلق ہمیں یقین نہ ہو کہ وہ دشمن کی متحرک فوج کو روک سکتی ہے۔

۵۔ دشمن ہماری اگلی صف کو چیر کر آگے بڑھے اور ہمیں گھیرے میں لینے کی سعی کرے تو ہماری عقبی فوجیں ہماری مدد کر سکتی ہیں۔

۶۔ اگر محفوظ فوج کافی ہو۔ تو اس تمام محفوظ فوج کو اگلی صفوں کے عین عقب میں جمع نہ کیا جائے۔ بلکہ ایک حصّہ کو اسی طرح رکھ کر باقی محفوظ افواج کو اگلی صفوں کے پیچھے ترچھی قطاروں میں کھڑا کیا جائے۔ تاکہ دشمن کے دستے اگلی صفوں کو نرغے میں لینے کی سعی کریں۔ تو یہ فوجیں جو ترچھے خطوط میں کھڑی ہوتی ہیں۔ دشمن کی کوشش کو ناکام کر دیں۔

۷۔ دفاع کے ساتھ اگر ممکن ہو۔ تو حملہ کی بھی صورت نکالی جائے۔

۸۔ دفاعی جنگ میں دشمن کا سکوت بالعموم طوفان سے پہلے کا سکوت ہوتا ہے۔

۹۔ دفاع کا ایک منفی پہلو یہ بھی ہے۔ کہ ایسی جنگ ہمارے دروازہ پر ہوتی ہے۔

۱۰۔ دفاعی جنگ میں قلعہ بند علاقے (FORTRESS AREAS) بڑی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ ایسی جنگ میں دفاعی مراکز کا قیام ایک ضروری امر ہے۔ اس اصول کے تحت دفاعی خط سے پیچھے مختلف مقامات کو قلعہ بند کر کے اُن میں غذا، اسلحہ اور دیگر سامانِ جنگ کثیر مقدار میں رکھا جاتا ہے۔ ان دفاعی مراکز کے درمیان متحرک فوجیں گشت کرتی رہتی ہیں۔ اور دفاعی خط پر جہاں ضرورت محسوس ہو ان سے مدد پہنچتی ہے۔ لیکن ان مراکز کا انتخاب بہت سوچ سمجھ کر کرنا چاہیئے۔ ورنہ توانائیاں ضائع ہو جاتی ہیں۔ اور کسی دفاعی مرکز کے سقوط سے دشمن کو کثیر مالِ غنیمت

مل جاتا ہے۔

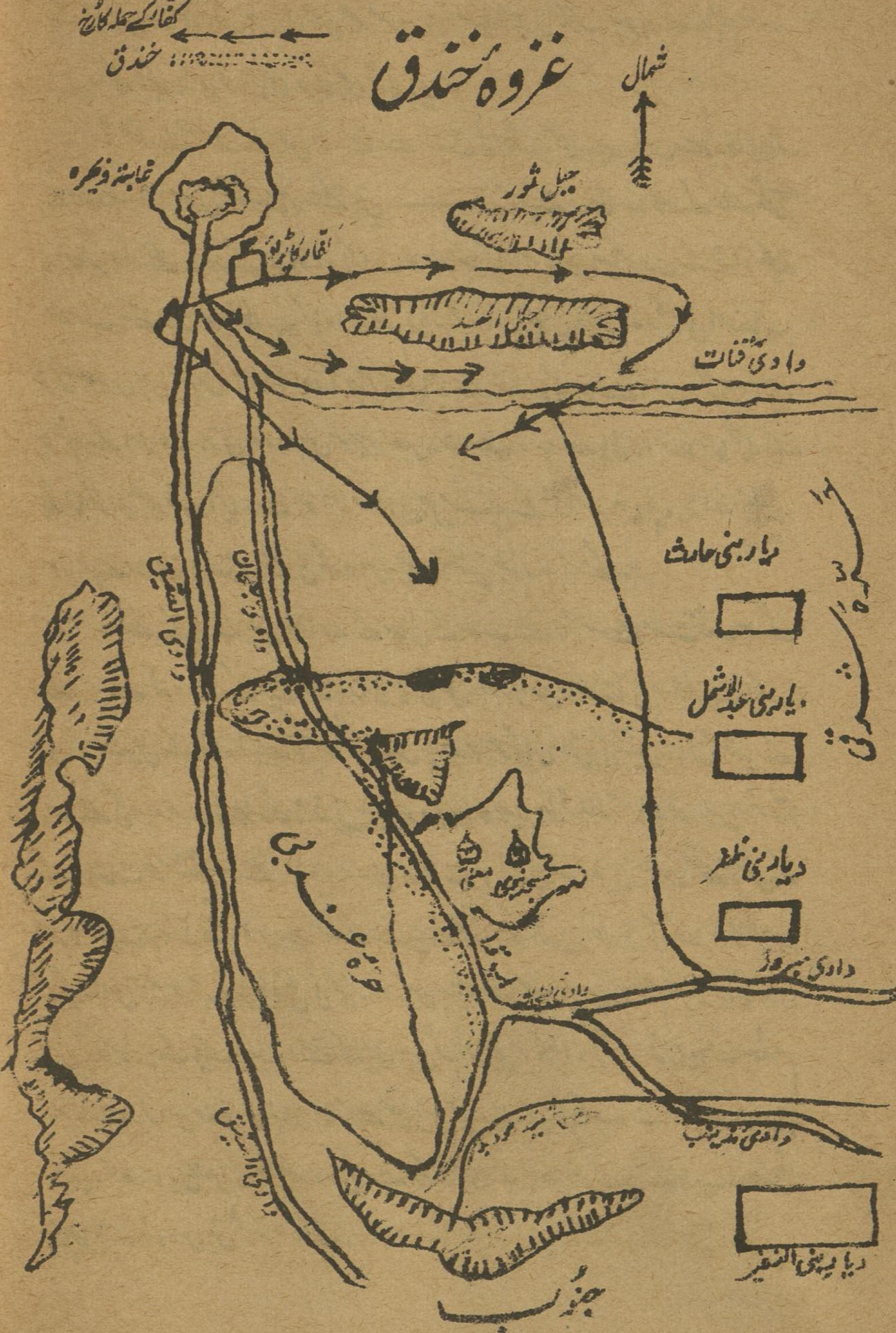
۱۱۔ کسی اہم مقصد کو پورا قوت سے حاصل کیا جائے۔

۱۲۔ لیکن دفاعی جنگ میں بھی محض غیر ضروری احتیاط جنگی تکنک نہیں ہے۔ اہم مقصد کے لیے بڑی قربانیاں دینا ہی پڑتی ہیں۔

آنحضرت صلعم نے جس طریقے سے خندق کی جنگ لڑی ہے۔ اس سے دفاعی جنگ کے مندرجہ بالا اصول مستنبط ہو سکتے ہیں۔ —— آپ اپنے رفقائے کار کے ساتھ گھوڑے پر سوار ہو کر نکلے۔ شہر کے اطراف و اکناف کا معائنہ کیا۔ مسلمان سپاہیوں کے پڑاؤ کے لیے مناسب مقامات کا انتخاب کیا۔ اور حکم دیا کہ عورتوں، بچوں، غلہ اور قیمتی اسباب کو گڑھیوں میں جنہیں آطام اور آجام کہا جاتا تھا۔ محفوظ کیا جائے۔ ان گڑھیوں میں جو شہر کے اطراف بڑی تعداد میں موجود تھیں۔ مناسب رسد اور پانی کا انتظام کیا گیا۔ ایک جگہ نیا کنواں بھی کھودا گیا۔ طے ہوا کہ مسلمان جبلِ سلع کے دامن میں اپنا پڑاؤ ڈالیں۔ اور اپنے سامنے ایک ایسی خندق کھود لیں۔ جسے دشمن عبور نہ کر سکے۔

مدینے کے جنوب میں باغات کے جال کے سبب سے راستے بہت تنگ ہو گئے تھے۔ جن سے گذرنے کے لیے قطار بنانی پڑتی تھی۔ اور بعض راستوں پر تو صرف ایک ہی اونٹ چل سکتا تھا۔ ایسے تمام راستوں پر جابجا چوکیاں مقرر کی گئیں۔ تاکہ دشمن کے ہر حملے کی مزاحمت کی جاسکے۔ مشرق میں یہودیوں کا قبیلہ بنو قریظہ آباد تھا۔ جس سے مسلمانوں کے تعلقات خوشگوار تھے —— ان حالات میں شمالی اور مغربی سمتوں سے ہی دشمن کے حملہ کا خطرہ ہو سکتا تھا۔ اس لیے سب سے پہلے شمالی علاقے میں خندق کی کھدائی کا فیصلہ کیا گیا۔ اس تمام رقبہ کی پیمائش کی گئی۔ اور تین ہزار رضاکاروں میں یہ کام تقسیم کیا گیا۔ دس دس آدمیوں کے ایک ایک دستے کو بیس بیس گز اراضی کا ٹکڑا دیا گیا۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس خندق کی لمبائی ساڑھے تین میل تھی۔ چوڑائی کی تفصیلات دستیاب نہیں ہو سکتیں۔ البتہ تاریخ میں یہ واقعہ درج ہے۔ کہ دشمن کے بعض سواروں نے جب اسے عبور کرنا چاہا۔ تو وہ اس میں گر کر مر گئے۔

شمال میں یہ خندق حرۂ شرقی اور حرۂ غربی کو ملاتی ہوئی نیم دائرہ کی شکل میں
جبل سلع تک پہنچ گئی ۔ اس کے بعد مختلف قبائل نے اپنی حفاظت کے لیے جنوب میں قبا



کے گرد و نواح تک اس خندق کی توسیع کرلی۔ اس طرح مغرب میں بھی دو ڈھائی میل لمبی خندق تیار ہوگئی۔ بعض روایات کے مطابق خندق میں بعض جگہ دروازے بھی رکھے گئے تھے۔ اس سے مراد شاید چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں تھیں۔ جو خندق کی مختلف زنجیروں کے درمیان اتصال کا کام کرتی تھیں۔ اور جہاں دیکھ بھال کے لیے چوکیاں بھی قائم کی جاسکتی تھیں۔

آنحضرت صلعم نے اس زمانہ میں اپنی گھر کی سکونت ترک کر دی۔ اور ایک پہاڑی پر اپنا خیمہ لگا دیا۔ آپ نے خندق کی کھدائی میں بہ نفسِ نفیس حصّہ لیا۔ ایک جگہ ایک دستہ سنگِ مرمر کی چٹان توڑنے سے عاجز آگیا۔ تو آپ خود وہاں پہنچے اور خود اپنے ہاتھوں سے اُسے پاش پاش کر دیا۔

کھدائی مکمل ہونے ہی کو تھی کہ شوال میں لشکرِ قریش مدینے کی حدود میں داخل ہوگیا آنحضرت صلعم نے عورتوں بچوں وغیرہ کو گڑھیوں میں محفوظ کر دیا۔ اور ان کی حفاظت کے لیے مناسب انتظامات کیے۔ آپ کا خیمہ جبلِ ذباب سے ہٹا کر جبلِ سلع کے ایک محفوظ مقام پر لگا دیا گیا۔ اس خیمہ گاہ پر بعد میں مسجد فتح تعمیر کی گئی تھی —— مسلمانوں کے پاس تین ہزار سپاہی تھے۔ جنہیں متعدد حصّوں میں تقسیم کیا گیا۔ ان کو باری باری خندق کی نگرانی کے لیے متعین کیا گیا۔ تیر انداز دستے بھی جابجا مقرر کیے گئے۔ تاکہ دشمن اگر خندق کو عبور کرنے کی سعی کرے تو اُسے پسپا کیا جاسکے۔ فوج کا بڑا حصّہ وقتِ ضرورت کسی مقام پر کمک پہنچانے کی غرض سے آپ کی نگرانی میں رکھا گیا —— آپ کے چار سالار حضرت سلمانؓ، حضرت ابوبکرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت ابوذرؓ تھے۔ ان بزرگوں کے جہاں خیمے تھے وہاں بھی مسجدیں بطور یادگار تعمیر کی گئی ہیں۔

حملہ آوروں کی تعداد دس ہزار سے زائد بتائی جاتی ہے[1]۔ ان میں سے قریش، کنانہ، اور احابیش نے وادیٔ عقیق کے قریب اپنے پڑاؤ ڈالے اور غطفان اور بنو اسد جبلِ احد سے بڑرومہ تک پھیل گئے۔ اس علاقہ میں پانی اور چارہ کی افراط ہوتی تھی۔

---

[1] بعض روایات کے مطابق یہ تعداد چوبیس ہزار تھی۔

مسلمانوں کے دستے باری باری خندق کا پہرہ دیتے اور جب کبھی دشمن کسی نقطہ پر اپنی قوت جمع کر کے خندق کو عبور کرنا چاہتا تو تیر انداز اُس کے چھکے چھڑا دیتے۔ اور متحرک دستے اُس کی مزاحمت کے لیے وہاں پہنچ جاتے۔ متعدد مرتبہ دشمن کے چند شہسوار اپنے گھوڑوں کو خندق کدانے میں کامیاب ہو گئے۔ لیکن انہیں تہہ تیغ کر دیا گیا۔ کچھ سوار اس کوشش میں خندق کے اندر گر کر ہلاک ہو گئے۔ ایک مرتبہ رات کی تاریکی میں مسلمانوں کے دو دستے گشت کر رہے تھے۔ ہر ایک نے دوسرے کے متعلق سمجھا۔ کہ دشمن خندق کو عبور کر کے اِس پار آ گیا ہے۔ چنانچہ ایک نے دوسرے پر حملہ کیا جس میں کچھ لوگ زخمی ہوئے اور کچھ زخموں کی تاب نہ لا کر مر گئے۔ لیکن بہت جلد شعار کے منہ سے نکلنے سے غلط فہمی رفع ہو گئی۔ اور ہتھیار روک لیے گئے۔ آنحضرت صلعم کو اطلاع ہوئی۔ تو آپ نے مرنے والوں کو شہادت کا درجہ دیا۔ لیکن خون اور زخم پر معاوضے اور مرہجے کو عاید نہیں ہونے دیا۔

محاصرہ طویل ہو گیا تو مدینے کے مشرق میں رہنے والے یہود بنو قریظہ کی بھی نیت بدلنے لگی اور آنحضرت صلعم کے جاسوسوں نے اُن کی غداری کی توثیق بھی کر دی۔ صورتِ حال نازک سے نازک تر ہو رہی تھی۔ کیونکہ یہ یہودی اگر شہر میں گھس آتے تو مسلمان ان کی مزاحمت کا کوئی انتظام نہیں کر سکتے تھے۔ اُن کے پاس ڈیڑھ ہزار سپاہی تھے۔ لیکن ان کے مقابلہ کے لیے آنحضرت صلعم اپنی مختصر فوج کو خندق سے ہٹا نہیں سکتے تھے۔ نیز اندرونِ شہر غلہ کی کمی اور منافقوں کی غداری کے امکانات پیدا ہو رہے تھے۔ شکست اور تباہی کا ہر وقت اندیشہ لاحق تھا۔ ہر آن مدینے کے سقوط کا خطرہ لگا ہوا تھا۔ ——— اور سرکارِ مدینہ کے تدبر کا سخت امتحان ہو رہا تھا۔ لیکن آپ کی پیشانی پر کوئی بل نہیں آیا۔ چہرۂ مبارک سے کوئی پریشانی ظاہر نہیں ہوئی۔ اور مایوسی آپ کے قریب پھٹکنے بھی نہیں پائی۔

آپ نے نہایت ٹھنڈے دل سے معاملہ کے ہر پہلو پر غور کیا۔ اور ایک مکمل لائحہ عمل تیار کر لیا۔ آپ نے چند قاصد خفیہ طور پر غطفانیوں اور فزاریوں کے سرداروں

کے پاس بھیجے۔ اور یہ ایجاب کیا۔ کہ وُہ لوگ مدینے کی کھجوُر کی فصل کا معقول حصّہ لے کر محاصرہ سے دستبردار ہو جائیں۔ لیکن ان کی شرائط سخت تھیں۔ جس پر آپ راضی نہیں ہوئے اور اس طرح کوئی معاہدہ مکمل نہ ہو سکا۔ اس کے بعد آپؐ نے دُوسری تدبیر اختیار کی۔ محاصرہ طویل ہو جانے کے باعث حملہ آوروں کا آذوقہ ختم ہو رہا تھا۔ مُسلمانوں نے ان کی آنے والی رسد بھی لُوٹ لی تھی۔ ان حالات میں وُہ بنوُ قریظہ کو پے در پے قاصد بھیج کر مجبور کر رہے تھے۔ کہ وُہ مسلمانوں پر پیچھے سے حملہ کر دیں ــــــ آپؐ نے اس صُورتِ حال سے فائدہ اُٹھایا۔ اور چند اشخاص کو جو ابھی ابھی مُسلمان ہُوئے تھے۔ اور جن کے مشرف باسلام ہونے کی خبر عام نہیں ہُوئی تھی۔ بنو قریظہ کے پاس بھیجا۔ ان اشخاص نے وہاں جا کر کہا کہ ہو سکتا ہے کہ قریش محاصرہ اُٹھا کر چلے جائیں۔ ایسی صُورت میں آپ لوگ مسلمانوں کا تنہا مقابلہ نہیں کر سکیں گے۔ اس لیئے حملہ کرنے سے پہلے مناسب یہ ہے۔ کہ قریش سے کچھ یرغمال طلب کیئے جائیں۔ تاکہ وُہ لڑائی کو انتہا تک جاری رکھیں۔ یہ بات بنی قریظہ کی سمجھ میں آگئی۔ اس کے بعد یہ اشخاص قریش کے کیمپ میں پہنچے اور انہیں باور کرایا۔ کہ بنی قریظہ اور آنحضرت صلعم میں سازش ہو گئی ہے۔ جس کی پیش رفت میں وُہ قریش کے سرداروں کو طلب کر کے آنحضرتؐ کے حوالہ کرنا چاہتے ہیں۔ تھوڑی دیر میں بنی قریظہ کے قاصد یرغمال طلب کرنے کے لیئے وہاں پہنچ گئے۔ اور قریش کو یقین ہو گیا۔ کہ بنی قریظہ نے مُسلمانوں سے سازباز کر لی ہے ــــــ! دیگر ذرائع سے بھی آپؐ نے یہی بات قریش کے ذہن نشین کرا دی۔ جس کے باعث وُہ بنی قریظہ کے سخت مخالف ہو گئے۔

اس محاصرے میں شوّال کا مہینہ ختم ہونے کے قریب تھا۔ اور ذیقعد شروع ہونے کو تھا جس میں اہلِ قریش مذہباً جنگ نہیں کر سکتے تھے۔ دیگر حالات بھی اُن کے لیئے دُشواری کا سبب بن رہے تھے۔ رسد تھوڑی رہ گئی تھی موسم خراب ہو رہا تھا۔ بارش، سردی اور آندھیوں کی وجہ سے محاصرہ کنندگان پریشان[1] ہونے لگے اور فتح کی کوئی صُورت

---

[1]: تین عناصر (عناصر ثلاثہ) حربی کارروائی اور جنگ کے نتائج پر مؤثر ہوتے ہیں۔

۱۔ زمین :ــــ زمین کی صورتِ حال کا پہلے ہی سے بڑی حد تک اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اور اس کو ارکانِ ثلاثہ سے ایک حد تک گریز بھی ممکن ہے ـــــ (باقی حاشیہ اگلے صفحے کے نیچے ملاحظہ ہو)

ان کے لیے باقی نہیں رہی۔ چنانچہ ابوسفیان نے ایک رات تمام سرداروں کے سامنے حالات کی وضاحت کی۔ اور سب کو مشورہ دیا۔ کہ صبح ہونے سے پہلے لوٹ جانا چاہیئے تاکہ مسلمان اُن کا تعاقب نہ کرسکیں۔ اس کے بعد وُہ اپنے اُونٹ پر سوار ہو کر روانہ ہوگیا۔ اور اس کے پیچھے اس کے ساتھی بھی چل نکلے —— صبح ہوئی تو اہلِ مدینہ نے اپنے دشمنوں کو موجود نہ پایا۔ اس پر آنحضرت صلعم نے کچھ سواروں کو خبر لانے کے لیے بھیجا اور کچھ کو ہدایت کی۔ کہ پسپا ہونے والے دشمن کو ہراساں کیا جائے۔ لیکن باقاعدہ جنگ سے انہیں منع کیا۔ کیونکہ آپ کو معلوم تھا۔ کہ بنو قریظہ سے کسی وقت بھی مدینے کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے —— اس کے بعد بنو قریظہ کا محاصرہ کیا گیا جو پچیس دن جاری رہا۔ اور بالآخر سعد بن معاذؓ ثالث مقرر ہوئے جن کے فیصلے کی رُو سے یہودیوں کا سارا مال ومتاع مسلمانوں میں تقسیم کر دیا گیا۔

جنگِ خندق کے حسب ذیل پہلو روشن ہیں :-

۱۔ اس جنگ کا منصوبہ نہایت سادہ اور مناسب تھا۔ مسلمانوں کے تین ہزار سپاہیوں کو دُشمن کے سات ہزار سپاہیوں کے مقابلہ میں اپنے شہر کی حفاظت کرنی تھی۔ نیز یہ امر بھی سرکارِ مدینہ کے پیشِ نظر تھا کہ انسانی خون جہاں تک ممکن ہو۔ نہ بہایا جائے۔ چنانچہ حملہ آوروں کی راہ میں خندق کھود کر آپ نے نہ صرف اُن کے عدوی تفوق ہی کو زائل کیا۔ بلکہ خونریزی اور خون آشامی سے بھی حتی الامکان گریز کیا۔

۲۔ اپنی مہارتِ فنیؔ کی بدولت آپ نے موسم کی تبدیلی سے بھی پُورا فائدہ اٹھایا۔ آپ نے دیر تک دُشمن کو مصرُوف رکھا۔ اور جب موسم خراب ہوگیا۔ تو اُسے اپنا محاصرہ

۱۔ موسم :- موجودہ سائینس کی مدد سے موسم کا حال معلوم تو کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اس پر قابو حاصل کرنے میں سائینس ابھی تک کامیاب نہیں ہوسکی ہے۔

۳۔ اتفاقات :- اتفاقی صورتوں کا پیش قیاسی ممکن نہیں ہے۔ یہ صورتیں حربی کارروائیوں میں مزاحم ہوتی رہتی ہیں۔ اور بہترین نتائج کے حصول میں رکاوٹ پیدا کرتی ہیں —— اسی لیے کہا جاتا ہے۔ کہ " جنگ کوئی قطعی سائینس نہیں ہے ——

(- بقیہ حاشیہ پچھلے صفحہ سے)

اُٹھا لینا پڑا۔

۳۔ آپ نے نہایت احتیاط سے جنگ کا نقشہ ترتیب دیا۔ مدینے پر بڑا حملہ شمال اور مغرب ہی کی طرف سے ہو سکتا تھا۔ لہٰذا ان سمتوں میں خندق کے ذریعے متوقع حملوں کا انسداد کیا گیا۔ لیکن جنوب اور مشرق کے تنگ راستوں سے بھی پیادہ فوج شہر میں داخل ہو سکتی تھی اس خطرہ کے مقابلہ کے لیئے آپ نے ان گڑھیوں (آطام) کو جو ان راستوں میں واقع تھیں۔ قلعہ بند کر کے ان میں تیر انداز متعین کر دیئے۔ تاکہ دشمن آگے بڑھ نہ سکے۔ آپ نے ان سمتوں کی پہاڑیوں پر بھی چوکیاں مقرر کر دیں۔ تاکہ دروں میں سے گزرنے والے دشمن کی راہ میں مشکلات پیدا کی جائیں۔

۴۔۔ جنگ کے اصولوں پر تبصرہ کرتے ہوئے بیان کیا گیا ہے کہ تاریخ کی کم و بیش تمام جنگیں اقدام کرنے والی فوجوں نے جیتی ہیں۔ اور خطوطی یا حصاری دفاع (Defence) بالعموم ناکام رہا ہے۔ لیکن غزوۂ خندق اس نظریہ کا ایک شاندار استثنیٰ ہے۔ اور سپہ سالارِ مدینہ کی حربی مہارت کی ایک روشن مثال دُنیا کے سامنے پیش کرتا ہے۔ نہ صرف ہنی بال، سکندر اور چنگیز خاں ہی کے زمانے میں۔ بلکہ دوسری جنگِ عظیم میں بھی وہی فریق ناکام ہوتا رہا ہے جس نے اقدام کی بجائے خطوطی دفاع پر حصّہ لیا ہو۔ چند مثالیں درج ذیل ہیں:۔

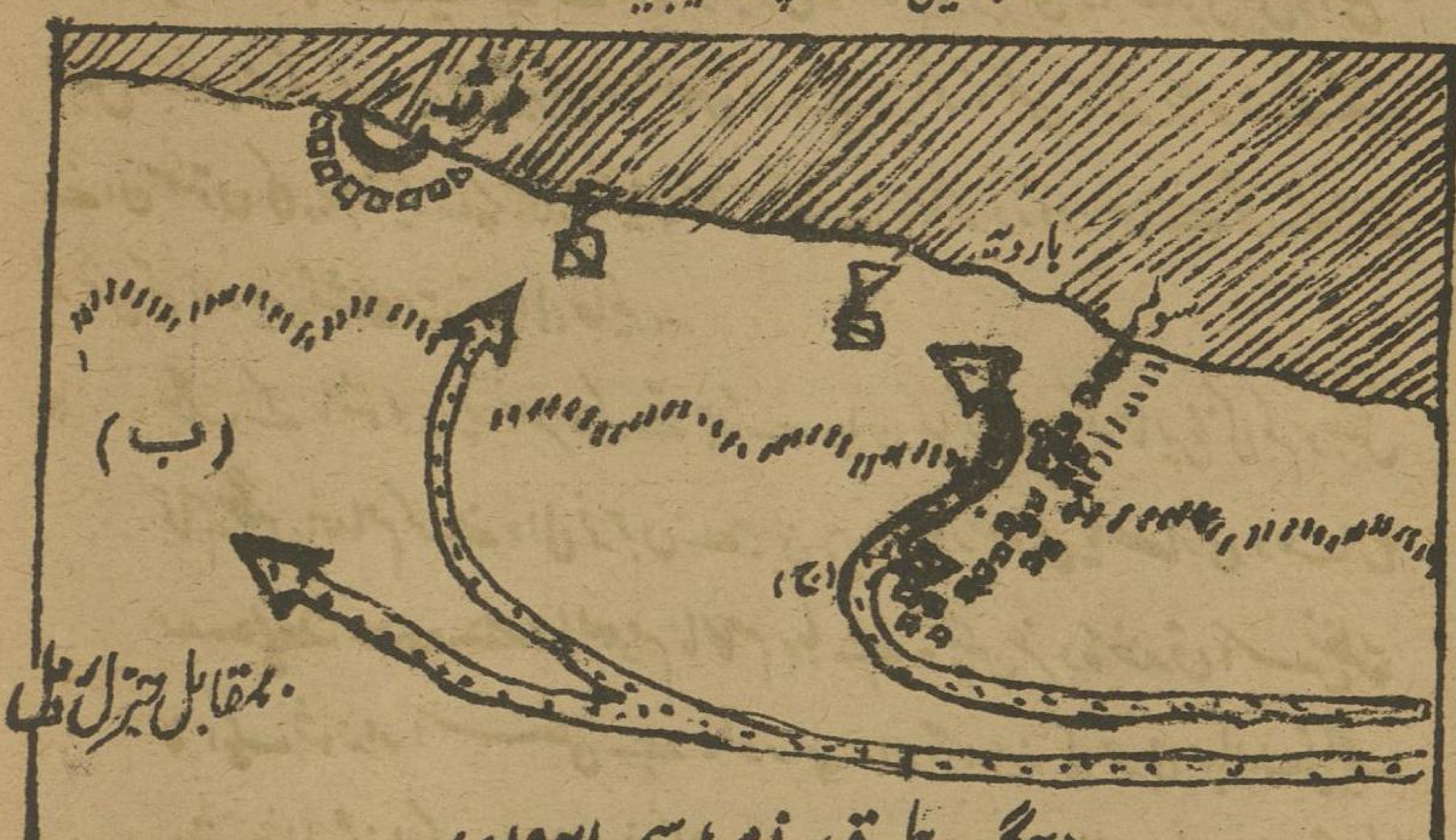
۱۔ جنگ سدی بارانی سنہ ۱۹۴۰ء:۔



اطالوی جرنیل گریزیانی نے اپنی فوجوں کے ذریعے ایک دفاعی خط قائم کیا تھا۔
مقام الف پر متحدین کی فوجوں نے اپنی کثیر قوت کو مرکوز کر کے دفاعی خط کو توڑ دیا۔ اور
اندر گھس کر عقب سے اطالوی لشکر کو گھیرے میں لے لیا۔ اور انہیں تباہ کر دیا۔

۲۔ جنگ طبرق، نومبر، دسمبر ۱۹۴۱ء

مندرجہ ذیل نقشہ پر غور کیجیے:۔



:۔(جنگ طبرق، نومبر دسمبر ۱۹۴۱ء):۔

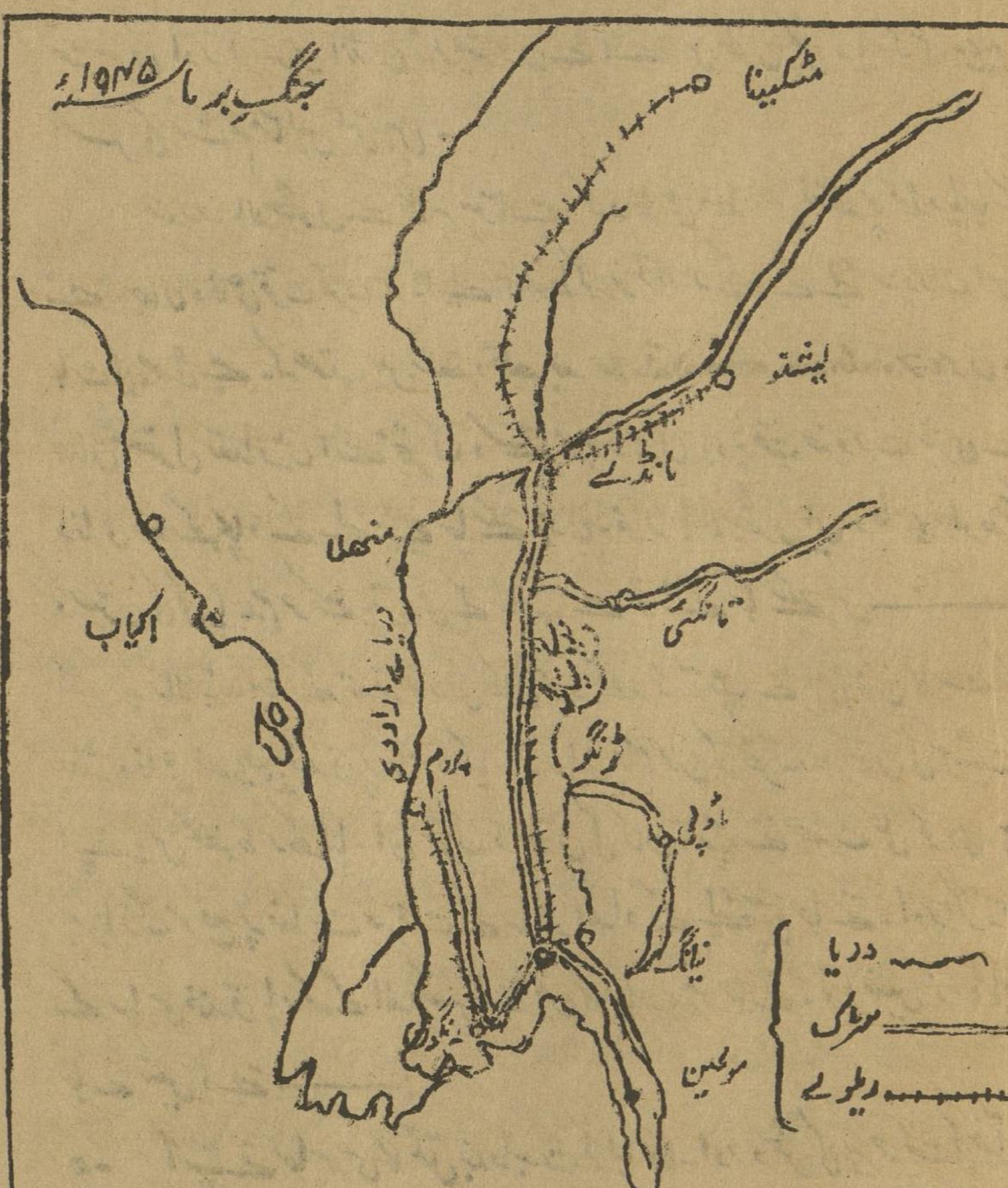
جنرل رومل نے سولم کے جنوب میں اپنی فوج کے دفاعی خطوط قائم کر رکھے تھے
متحدین کی متحرک فوج نے مقام (ج) سے گزر کر اس خط کو نرغہ میں لے لیا۔ رومل پسپا
ہو کر طبرق میں قلعہ بند ہو سکتا تھا۔ لیکن متحدین کی فوجوں نے تیزی سے بڑھ کر اس
مقام پر قبضہ کر لیا اور پھر جرمن متحرک دستوں پر غالب آ کر رومل کی پیادہ فوجوں کو
تباہ کر دیا۔

۳۔ جنگ ملایا و برما:۔

طویل دفاعی خط کے قیام سے حمل و نقل کی توانائیاں ضائع ہو جاتی ہیں۔ اس خط
کو محفوظ رکھنے کے لیے قلعہ بند قاعدے (Bases) قائم کرنا پڑتے ہیں۔ جن کے درمیان
متحرک دستے گشت کرتے رہتے ہیں۔ ان قلعہ بند علاقوں میں غلہ اور اسلحہ کے بڑے
بڑے ذخیرے رکھے جاتے ہیں۔ جہاں سے دفاعی خط کو ان اشیاء کی فراہمی ہوتی رہتی ہے

ملایا میں انگریزوں نے یہ غلطی کی تھی۔ کہ دفاعی خطوط تو قائم کر لیئے تھے لیکن قلعہ بند قاعدے ان کے استحکام کے لیئے موجود نہیں تھے۔ اور نہ حمل و نقل کے کافی ذرائع فراہم کیئے گئے تھے۔ نتیجہ یہ ہُوا۔ کہ جاپانی فوج اقدام کرتی رہی اور انگریزوں کے دفاعی خطوط یکے بعد دیگرے ٹوٹتے رہے۔ یہاں تک کہ سارے ملایا پر جاپانیوں کا قبضہ ہو گیا۔ اس کے بعد برما کی باری آئی۔ اور وہاں بھی انگریزی فوجیں اسی کمزوری کے باعث ماہ جولائی ۱۹۴۵ء میں گھِر کر شکست کھا گئیں۔

لیکن برما میں متحدین کی فتح کا سلسلہ اُس وقت شرُوع ہُوا جبکہ وُہ اقدام کرنے کے موقف میں آئے۔ اور اسی اصُول پر انہوں نے اپنی جدوجہد کا آغاز کیا۔



شمال کی طرف سے متحدین کی متحرک فوج کا سیلاب پروم اور رنگون کی طرف بڑھتا گیا۔ جس کی وجہ سے جاپانی فوجیں کئی حصوں میں تقسیم ہو گئیں۔ اس وقت تک جاپان کی متحرک فوجیں شدید نقصان اُٹھا چکی تھیں۔ اور ان میں مزاحمت کا دم باقی نہیں تھا۔ مجبوراً بڑی بڑی توپیں میدان میں چھوڑ کر وہ پہاڑی علاقوں کی طرف پسپا ہو گئیں۔ اس کے ساتھ ہی پینگو یوما کے علاقہ میں جاپان کی اٹھائیسویں فوج دو طرف سے گھر گئی۔ رفتہ رفتہ اُس کی رسد ختم ہوتی گئی۔ اور اس میں سخت وبائیں پھوٹ پڑیں۔ چنانچہ چار و لاچار ۱۹ اور ۲۰ جولائی ۱۹۴۵ء کی درمیانی رات کو جاپانی فوج نے حلقہ توڑ کر مشرق کی طرف نکل جانے کی آخری کوشش کی ——— لیکن دریائے تیانگ کے کنارے سترہویں اور انیسویں انڈین ڈویژنوں نے اُسے اس طرح کچل دیا۔ کہ تاریخ میں اس کی بہت کم مثالیں ملتی ہیں۔

مندرجہ بالا جنگوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ دفاعی خط اُس نقطہ پر توڑ دیا جا سکتا ہے جہاں دفاعی قوت کمزور ہو۔ ایسے خطوط کو برقرار رکھنے کے لئے ضرورت اس بات کی ہوتی ہے۔ کہ عقب میں متعدد مخلصہ بند علاقے (Concentration areas) ہوں۔ جہاں معقول تعداد میں ایسے متحرک دستے موجود ہوں جو بوقتِ ضرورت تیزی سے دفاعی خط کے بچاؤ کے لیئے بھیجے جا سکتے ہوں۔ محولہٗ بالا جنگوں میں دفاعی خطوط متحرک دستوں کی کمی یا عدمِ حرکت پذیری کے سبب سے توڑے جا سکتے ہیں ———

لیکن سپہ سالارِ مدینہ کے تدبر اور فنی کمال کو دیکھیئے کہ آپ نے اپنی فوج کا صرف ایک حصہ دفاعی خط یعنی خندق پر مامور کیا۔ اور باقی تمام فوج کو متحرک دستوں کی حیثیت سے اپنے پاس محفوظ رکھ لیا۔ ان متحرک دستوں کی کمان آپ نے حضرت علیؓ کر دی۔ جو ہر نازک موقع پر نہایت سرعت کے ساتھ امداد کے لیئے پہنچ جاتے۔ اور اگر دشمن کے سپاہی خندق پار کر کے اندر گھس آنے میں کامیاب ہو جاتے۔ تو انہیں زندہ واپس جانے نہیں دیتے ———!

۵۔ آپ نے جاسوسی کا مکمل بندوبست کر لیا تھا۔ اور دشمن کی ہر حرکت کی خبر آپ

کو مل جاتی تھی۔ ان جاسوسوں ہی کا یہ کمال تھا۔ کہ بنو قریظہ اور کفار مکہ میں غلط فہمی پیدا کی گئی۔ اور یہودیوں کے عقبی حملہ کے امکانات کو ختم کر دیا گیا۔

۶۔ جنگ میں حرکت پذیری کے ساتھ ساتھ اس بات کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ کہ فوجوں کو کھل کر لڑنے کا موقع ملے۔ بند مقامات اور تنگ علاقہ جات میں ضروری نقل و حرکت مشکل ہو جاتی ہے۔ اور سپاہیوں کو اپنا جوہر دکھانے کا موقع نہیں ملتا۔ مدینے میں جیساکہ اُوپر بیان کیا گیا ہے۔ بے شمار آطام (گڑھیاں) موجود تھے جو نہایت مضبوط مورچے ثابت ہو سکتے تھے۔ آنحضرت صلعم کی جگہ اگر کوئی دوسرا جرنیل ہوتا۔ تو قریش کی تیاریوں اور طاقت کے مدِ نظر شاید ان آطام میں قلعہ بند ہو جانا پسند کرتا۔ لیکن آپ کی دوربین نگاہوں نے دیکھ لیا۔ کہ ایسا کرنا انتہائی خطرناک ثابت ہو سکتا ہے کیونکہ ایسی صورت میں کفار کو حسب ذیل سہولتیں حاصل ہو جاتیں :۔

(الف) وہ مدینے کے سارے رقبہ میں پھیل جاتے اور انہیں غلہ، پانی اور چارہ آسانی سے فراہم ہوتا رہتا۔

(ب) اُن کی حرکت پذیری قائم رہتی۔ اس کے برعکس مسلمانوں کی حرکت پذیری معطل ہو جاتی اور اُن کی رسد کی فراہمی میں دشواریاں پیدا ہوتیں۔

(ج) کفار جس جگہ چاہتے۔ اپنی قوت مرکوز کر سکتے۔ لیکن مسلمانوں کی قوت تقسیم ہو کر کمزور پڑ جاتی۔ اور یہ تمام باتیں مسلمانوں کی شکست اور کفار کے غلبہ کی صورت میں منتج ہوتیں ——— لہٰذا سرکارِ دو عالم نے آطاموں میں محفوظ ہونے کی بجائے اپنے دفاعی خط کو اس قدر طول دیا کہ آپ کی فوجوں کی حرکت پذیری بھی برقرار رہ سکی، مدافعت بھی آسانی سے ہو سکی اور سامان رسد کی فراہمی کا سلسلہ بھی بڑی حد تک جاری رہ سکا۔

۷۔ لیکن خندق کی فتح میں جنگ کے نقشے اور منصوبے سے زیادہ سپہ سالارِ اسلام کے استقلال اور آہنی عزم کو دخل ہے۔ کفار کا لشکر جرار بہترین اسلحے

لیس تھا۔ اُسے ہر طرح کی سہولت حاصل تھی۔ اور اپنے وسائل کے پیشِ نظر اُسے یقین تھا۔ کہ چند روز ہیں نہیں۔ تو چند ہفتوں میں مسلمانوں کا قلع قمع ہو جائیگا اس کے برعکس مسلمانوں کو ایک طرف زبردست قوت سے سابقہ تھا۔ تو دوسری طرف مدینے کے مشرق میں رہنے والے بنو قریظہ کے ڈیڑھ ہزار مسلح جوانوں سے بھی شدید خطرہ لاحق تھا۔ جن کو روکنے کے لیے نہ کوئی خندق موجود تھی۔ اور نہ شمالی و مغربی محاذوں پر اتنی فوج تھی۔ کہ اس کے کسی حصّہ کو ان یہودیوں کی مقاومت کے لیئے علیحدہ کیا جا سکتا ——— محاصرہ روز افزوں شدت اختیار کرتا گیا قریش اور بنو قریظہ کی سازش مکمل ہونے لگی۔ اور صورتِ حال نازک تر ہوتی گئی حضرت ابوبکر صدیق بیقرار ہو کر بار بار جبل سلع کی چوٹی پر بیٹھ جاتے اور مشرق کی طرف نظر دوڑاتے۔ اور جب مدینے کے مکانوں کو پُرسکون پاتے۔ تو خدا کا شکر ادا کر کے نیچے اُتر آتے۔ خود قرآن حکیم نے بھی ان تشویشناک حالات کا اظہار اس طرح کیا ہے :-

"جب وُہ تمہاری طرف آئے۔ تمہارے اُوپر سے اور تمہارے نیچے سے اور نظریں خیرہ ہو گئیں۔ اور کلیجے مُنہ کو آنے لگے۔ اور تم خدا کے متعلق عجیب بدگمانیاں کرنے لگے۔ اس موقع پر ایمان والوں کی آزمائش ہوئی اور ان میں ایک شدید زلزلہ آگیا"

لیکن سپہ سالارِ مدینہ کے چہرے سے کوئی ہراسانی ظاہر نہیں تھی۔ دل میں مایوسی اور ہراس کا کوئی شائبہ تک نہیں تھا۔ آپ کو خدا کی نصرت اور اپنے عزم پر کامل بھروسہ تھا ——— ہر اطلاع کو آپ نہایت سکون سے وصول کرتے اور ہر نازک صورت کے مقابلہ کے لیئے ٹھنڈے دل سے غور فرماتے۔ سپاہیوں کی حوصلہ افزائی کرتے جرنیلوں سے مشورہ اور ان کی رہنمائی فرماتے۔ اور جنگ کے ہر پہلو پر نظر رکھکر ہر بات کے انتظام کی صورت نکال لیتے ——— ہر شخص کی نگاہیں آپ ہی کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ آپ ہی کی شخصیت ان ہولناک طوفانوں میں روشنی کا مینار بنی

ہوئی تھی اور اس طرح جنگ کی تمام مشینری آپ ہی کی ذاتِ مبارک کے اطراف تیزی سے گھومتی جا رہی تھی ——!

عام بے چینی کے تلاطم میں آپ ایک چٹان کی مانند کھڑے تھے۔ اس عالمِ پریشانی کے باوجود آپ کی خود اعتمادی میں کوئی تزلزل پیدا نہیں ہُوا۔ اور آپ کے پائے استقلال میں کوئی لغزش نظر نہیں آئی —— بنو قریظہ کی سازش کی افواہیں جب پھیل گئیں۔ تو آپ نے صُورتِ حال کی تحقیق کے لیے جاسوس بھیجے۔ لیکن آپ نے محسوس کیا۔ کہ اگر خبروں کی توثیق ہوگئی۔ تو عام اخلاقی حالت پست سے پست تر ہو جائیگی۔ اور مدافعت کرنے والوں میں کھلبلی پڑ جائے گی۔ اس لیے ان جاسوسوں کو راز میں سمجھا دیا۔ کہ اگر بات صحیح ہو۔ تو واپس ہو کر کھلم کھلا اعلان نہ کیا جائے۔ لیکن بظاہر اطمینان دلا کر معینہ الفاظ میں آپ کو آگاہ کر دیا جائے۔ تاکہ آپ۔ تو اس کا مطلب سمجھ سکیں۔ مگر عوام بے خبر رہیں —— اس واقعہ سے ظاہر ہے۔ کہ نہ صرف تمام امور کی ذمہ داری آپ نے لے لی تھی۔ بلکہ آپ کو اپنے تدبر پر بھی اعتماد تھا۔ آپ نے سوچ لیا تھا۔ کہ اگر سازش کی اطلاع صحیح بھی ہو۔ تو دیگر ذرائع سے خطرے کا انسداد کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہُوا۔ جاسوسوں نے لوٹ کر سازش کی خبروں کی توثیق کر دی۔ آپ نے کمالِ متانت سے اس پر غور کیا۔ اور پھر بساطِ سیاست پر کچھ مہرے کر اس طرح آگے اور پیچھے کیا۔ کہ کفار کی تدبیر الٹی ہو گئی۔ سازش ناکام ہو گئی۔ اور قریشِ مکہ عاجز و پریشان ہو کر مکہ کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے ——!

فتحِ مکّہ

مدینے پر کفارِ مکہ کی چڑھائی سے مخالف عناصر کی ہمت افزائی ہوئی تھی۔ کئی گروہ شر انگیزی کر رہے تھے۔ اور متعدد قبیلوں نے سر اُٹھا رکھا تھا۔ اس لیے غزوۂ خندق اور غزوۂ بنی قریظہ کے بعد آنحضرت صلعم نے کئی مہمیں سر کیں۔ بنی لحیان اور بنی مصطلق کی سرکوبی کی گئی۔ غمر اور ذی القصہ کے باشندوں کی گوشمالی ہوئی۔ بنی ثعلبہ اور بنی سلیم کی سرزنش کی گئی۔ اور بنی جذام اور بنی فزارہ کو سزا دی گئی۔ ان معرکوں میں بہت سا مالِ غنیمت بھی مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔ آپ کے سالاروں کا ہر جگہ لوہا مانا جانے لگا۔ سارے علاقے پر آپ کی دھاک بیٹھ گئی۔ اور تمام قبائل نے محسوس کیا کہ آپ کے احکام کی تعمیل ہی میں اُن کی فلاح مضمر ہے۔ دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ مجاہدینِ اسلام کو نقل و حرکت اور اچانک حملوں کا وسیع تجربہ حاصل ہوا۔ اور ان کے حوصلے بلند تر ہوتے گئے۔

قریش کا زوال

محاصرۂ خندق کے بعد قریش کی قوت ٹوٹ گئی۔ اور مدینے پر اُن کی چڑھائیاں ختم ہو گئیں۔ بدر اور خندق کی ناکامیوں کے علاوہ اُن کے زوال کے کئی اور اسباب بھی تھے:-

(۱) معاشی:- ہجرت کے دو چار مہینے کے اندر ہی آپ نے ینبوع کے قبائل سے حلیف کر کے قریش کا کاروانی راستہ تقریباً بند کر دیا۔ اور مصر و شام سے اُن کی تجارت میں مشکلات حائل کر دیں۔ اس کے بعد اسلامی اثر رفتہ رفتہ نجد تک پھیل گیا۔ اور عراق کا راستہ بھی قریش کے لیئے مسدود ہو گیا۔ دوسری طرف یمن کے راستے یورپ اور ہندوستان سے اُن کی تجارت متاثر ہوئی اور اُن کی آمدنی بڑی حد تک گھٹ گئی۔ جنگِ خندق کے بعد آنحضرت صلعم کا حلقۂ اثر نجد سے گزر کر یمامہ تک پہنچ گیا۔ جہاں سے مکے کے باشندے اپنے لیئے غلہ حاصل کرتے تھے ———— اس طرح قریش کی نہ صرف

تجارت کو شدید نقصان پہنچا۔ بلکہ اُن کی غذائی صورتِ حال بھی خراب ہو گئی۔

(ب) سیاسی :۔ مسلمانوں کے عروج کے ساتھ ساتھ مختلف قبائل قریش کا ساتھ چھوڑتے گئے۔ اُن میں سے اکثر مسلمان ہو گئے۔ اور باقی مجبور و بے بس ہو کر رہ گئے۔ ۵ھ تک مکّہ کے اطراف اسلامی قبائل کی ایک زنجیر قائم ہو گئی۔

ان حالات میں مسلمانوں کے لیے اقدام کا موقع نکل آیا۔ اور اہلِ مکّہ صرف اپنی مدافعت پر مجبور رہ گئے۔

صُلح نامہ حدیبیہ

جنگِ خندق کے دوسرے سال یعنی ذیقعد ۶ھ میں آپؐ عمرہ کی غرض سے مکّہ کی طرف روانہ ہوئے آپؐ کا مقصد جنگ و جدال نہیں تھا۔ اسی لیے آپ نے قربانی کے لئے ستر اونٹ اپنے ساتھ رکھے تھے۔ ہمراہیوں کی تعداد ایک ہزار تین سو سے زائد بتائی جاتی ہے۔

آپؐ کی روانگی کی اطلاع پا کر اہلِ مکّہ آپؐ کے مقابلہ کے لئے نکلے اور انہوں نے اپنے معبودوں کی قسمیں کھا کر عہد کیا کہ آپؐ کو مکّے میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ اس خبر کے ملنے پر آپ عام راستہ چھوڑ کر پہاڑوں کے دشوار گزار راستوں سے ہوتے ہوئے ثنیۃ المرار پہنچ گئے۔ جو مکّے کے زیریں علاقے میں حدیبیہ کے آثار پر واقع ہے۔ اس وقت فنِ لشکر کشی کے لحاظ سے قریش ہار چکے تھے۔ کیونکہ آنحضرت صلعم اپنی بصیرت کی بدولت ایسے مقام پر پہنچ گئے تھے۔ جہاں سے آپ بآسانی مکّے میں داخل ہو سکتے تھے۔ آپؐ کی فوجیں لشکرِ کفار اور مکّے کے درمیان حائل ہو گئی تھیں۔ اور مکّے کا سقوط ایک معمولی بات تھی۔

کفار نے حالات کا مطالعہ کیا، اپنی کمزوری کو محسوس کیا۔ اور نامہ و پیام شروع کر کے خطرہ کو ٹال دینا چاہا ——— فریقین کے درمیان گفتگو ہوتی رہی۔ اور جب اہلِ مکّہ کو یقین ہو گیا۔ کہ آپؐ کا ارادہ جنگ کرنا نہیں ہے۔ تو انہوں نے آپؐ کے ساتھ ایک معاہدہ کر لیا۔ جو صُلح نامہ حدیبیہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس کی شرائط یہ ہیں :۔

۱۔ دس سال تک مسلمان اور قریش آپس میں کوئی جنگ نہیں کریں گے۔

۲۔ اس عرصہ میں ہر شخص محفوظ و مامون ہوگا۔

۳۔ قریش کا کوئی آدمی اپنے ولی کی اجازت کے بغیر آپ کے پاس آئے گا۔ تو آپ اسے اس کے ولی کے حوالہ کر دیں گے۔

۴۔ اگر آپ کا کوئی آدمی قریش کے پاس چلا جائے گا۔ تو قریش اسے آپ کے حوالے کرنے کے ذمہ دار نہیں ہوں گے۔

۵۔ فریقین کے درمیان کوئی لڑائی نہیں رہی۔ ہر شخص آزاد ہے کہ جس فریق سے چاہے جا کر ملے۔ لیکن آنحضرت صلعم مکے کے مسلمانوں کو اپنے ساتھ لے جانے کے حقدار نہیں ہوں گے۔

۶۔ اس سال آنحضرت صلعم عمرہ کیے بغیر لوٹ جائیں گے۔ آئندہ سال قریش شہر مکہ تین روز کے لیے خالی کر دیں گے۔ تاکہ آپ عمرہ کر سکیں۔

مسلمانوں کی طرف سے حضرت علیؓ نے صلح نامہ تحریر کیا۔ آپ نے جب الفاظ "رسول اللہ" لکھے تو کفار نے اس پر اعتراض کیا۔ آپ ان الفاظ پر مصر رہے۔ اور فرمانے لگے۔ کہ ان الفاظ کو قلمزد نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن آنحضرت صلعم نے خود مفاہمت کی شکل پیدا کر کے دستِ مبارک سے یہ الفاظ قلمزد کر دیئے۔

بادی النظر میں معلوم ہوتا ہے۔ کہ مسلمانوں نے دب کر یہ صلحنامہ تحریر کیا لیکن اس کی مضمرات پر غور کیا جائے۔ تو اس حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی بہبودی اور آئندہ کی شاندار فتح اس میں پوشیدہ تھی۔ خود تبارک و تعالے نے اس کو "اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا" سے تعبیر کیا ہے۔

آپ اس موقف میں تھے۔ کہ مکے میں فاتحانہ طور پر داخل ہو جائیں۔ لیکن ایسے داخلہ سے سخت خونریزی ہوتی۔ جو غیر ضروری ہونے کے باعث رحمت اللعٰلمین کے منصب کے مطابق نہیں ہو سکتی تھی۔ اس جنگ سے مفتوح قبائل میں جذبۂ انتقام پیدا ہوتا۔ اور جنگوں کا سلسلہ طویل ہو جاتا ——— ان حالات میں آپ نے

اپنے تدبر سے یہ واضح کر دیا کہ تفوق اور برتری کے باوجود آپ امن وصلح کے خواہاں ہیں۔ اور انسانی خون کا بہایا جانا آپ کا ہرگز منشا و مقصد نہیں ہے۔

لڑائی بند ہو جانے سے کفار کو موقع ملا کہ وہ آپ کو قریب سے دیکھیں اور آپ کی تعلیمات پر ٹھنڈے دل سے غور کر سکیں۔ چنانچہ اس صلح کے بعد کفار کثیر تعداد میں مسلمان ہو گئے۔ اور اسلام کو دن بدن تقویت حاصل ہوتی گئی۔ نیز اس صلح نامہ کے سبب سے ایک اور فائدہ مسلمانوں کو ہوا ——— وہ یہ کہ بغیر کسی لڑائی کے کفار کے حوصلے پست ہو گئے۔ اور ان کی رہی سہی طاقت بھی سلب ہو گئی ——— ! فنِ حرب کا یہ کمال ہوتا ہے کہ بغیر کسی خونریزی کے دشمن کی کمر توڑ دی جاتے۔ اور وہ مقصد حاصل کر لیا جائے۔ جو شدید خونریزی کے بعد بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔

غزوہ خیبر خیبر کے فتنہ پرور یہودیوں نے سر اٹھا رکھا تھا۔ مدینے سے خارج البلد ہونے والے اکثر یہودی یہاں پناہ گزین ہوئے تھے۔ بنو غطفان کے خلاف کوئی کارروائی ابھی تک نہیں ہو سکی تھی۔ اس لیے وہ بھی خیبر کے یہودیوں کی شہ پر فساد برپا کر رہے تھے۔ اور جنگ کی صورت میں ان دونوں گروہوں کا اتحاد یقینی سمجھا جا رہا تھا ——— ان حالات میں آنحضرت صلعم نے بڑی دانشمندی اور فنی مہارت سے کام لیا۔ آپ اپنی فوجوں کے ساتھ آگے بڑھنے لگے۔ لیکن ان دونوں گروہوں میں سے کسی ایک پر بالراست چڑھائی نہیں کی۔ بلکہ خیبر اور غطفان کی درمیانی سمت میں پیش قدمی کرتے چلے گئے۔ اس کا اثر یہ ہوا۔ کہ ان میں سے ہر ایک سمجھنے لگا کہ حملہ اسی پر ہونے والا ہے[1]۔ چنانچہ غطفان کے وہ دستے جو خیبر کی حفاظت کے لیے گئے ہوئے تھے واپس آگئے۔ اور یہودی تنہا رہ گئے اس طرح دشمن کی قوت تقسیم ہو گئی۔ اور آپ نے اچانک حملہ کر کے غطفان پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد خیبر کا رُخ کیا۔ اور اس علاقے کے تمام آطام رفتہ رفتہ فتح کر لیے۔ لیکن خیبر کے سقوط میں بڑی دشواریاں پیدا ہوئیں۔ اور جب بارہ دن تک مسلم فوج

---

[1] دشمن کی طاقت کو منقسم کر کے ان میں تذبذب پیدا کرنا ایک نہایت اہم حربی چال ہے!

سخت محاصرے کے باوجود کامیاب نہ ہو سکی تو تیرھویں دن آپؐ خود میدانِ جنگ میں پہنچے اور حضرت علیؓ کو سپہ سالار مقرّر کیا۔ جنہوں نے ایک طوفانی حملے میں خیبر کو فتح کر کے اُس کے سردار کنانہ بن الربیع بن ابی الحقیق کو گرفتار کر لیا ——

اس مہم میں آپؐ نے بنی حارثہ کے یہودیوں کی امداد حاصل کی تھی۔ اور اس طریقے سے دشمن عناصر کو ایک دوسرے کے خلاف استعمال کرنے میں آپؐ کامیاب ہو گئے تھے۔ ان خدمات کے عوض بنی حارثہ کے محیّصہ بن مسعودؓ کو خیبر کی اراضیات بٹوارے پر کاشت کے لیے دی گئیں۔

غزوۂ خیبر کے بعد وادیٔ القریٰ کے قبائل نے آپؐ کی اطاعت قبول کر لی۔ ہوازن اور بنی مرہ کے قبائل کی گوشمالی کی گئی۔ ۷ھ میں صُلح نامہ حدیبیہ کے مطابق آپؐ نے عمرہ ادا کیا۔ اور ماہِ صفر میں بنی ملوح کو سزا دینے کے لیے ایک دستہ روانہ فرمایا جس نے اُسے تباہ کر کے بہت سا مالِ غنیمت حاصل کر لیا۔

اسی اثناء میں عمروؓ بن العاص اور خالدؓ بن ولید بھی مسلمان ہو گئے! اور اول الذکر کو تین سو صحابہ کے ساتھ بنی قضاعہ سے دوستانہ مراسم کے قیام کے لیے روانہ کیا گیا۔

جنگِ مُوتہ آنحضرت صلعم نے زیدؓ بن حارث کی سرکردگی میں تین ہزار مجاہدین کا ایک لشکر شام کی طرف روانہ فرمایا۔ موتہ کے مقام پر رومیوں کی عظیم الشان فوج اور ان کے قبائلیوں کے بیشمار دستوں سے سخت جنگ ہوئی زیدؓ شہید ہو گئے۔ ان کے بعد آنحضرت صلعم کے حُکم کی تعمیل میں جعفرؓ بن ابی طالب اور اُن کی شہادت کے بعد عبداللہ بن رواحہ سالار مقرر ہوئے۔ لیکن وہ بھی جامِ شہادت نوش کر گئے۔ تو بالاتفاق رائے خالدؓ بن ولید کو سردار منتخب کیا گیا۔ خالدؓ کے ایک اچانک حملے کی تاب نہ لا کر رومی پیچھے ہٹ گئے۔ اور کافی دُور جا کر اپنے مورچے بنا لیئے۔ اس کامیابی سے مسلمانوں کے حوصلے بڑھ گئے۔ اور اُن کی صفیں فولاد کی طرح مضبوط ہو گئیں۔ آنحضرت صلعم کو واقعات معلوم ہوئے۔ تو آپ نے جہاد کا اعلان فرمایا جس کی وجہ سے رُومیوں کے متعدد حلیف قبائل خوفزدہ ہو کر جنگ سے

کنارہ کش ہو گئے۔ اور خود رومی بھی بالآخر میدان چھوڑ کر چلے گئے۔ خالدؓ بن ولید مظفر و منصور مدینے لوٹ آئے۔

مکے پر چڑھائی

آنحضرت صلعم کی بصیرت اور فنی مہارت سے قریش کو بدر میں اقتصادی اور سیاسی صدمہ پہنچا تھا جنگِ خندق میں انہیں اخلاقی شکست ہوئی تھی۔ اور صلح نامہ حدیبیہ اور اس کے بعد ۷ھ میں مسلمانوں کے حج کے سبب سے اُن کا ذہن بھی شکست خوردہ ہو گیا تھا ـــــ ان حالات میں مسلمانوں کا حلقۂ اثر وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا تھا۔ اکثر مخالف گروہوں کی سرکوبی اور متعدد قبائل کی حلیفی سے مکے کے اطراف مسلمانوں کا رُعب و اثر قائم ہو چکا تھا۔ اس طرح قریش کے مقابلہ میں آخری معرکہ کے لیے تمام حالات سازگار ہو گئے تھے۔ اور صرف مناسب موقع کی کمی باقی رہ گئی تھی۔ جو خود اہلِ مکہ کی عاقبت نااندیشی سے مسلمانوں کو ۸ھ میں حاصل ہو گیا۔

عرب کے دو قبیلے بنو بکر اور بنو خزاعہ ہمیشہ ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہتے تھے۔ صلح نامہ حدیبیہ کے وقت بنو بکر نے قریش کے ساتھ اور بنو خزاعہ نے مسلمانوں کے ساتھ دوستی اور رفاقت کا عہد کیا تھا ـــــ بنو بکر نے اپنے چند آدمیوں کے قتل کے انتقام کے لیے بنی الدیل سے سازش کی۔ بنی الدیل کے سردار نوفل بن معاویہ الدیل نے بنو خزاعہ پر شبخون مارا۔ بنو خزاعہ جب بھاگ کر دوسری طرف نکل گئے۔ تو بنو بکر نے اُن سے علانیہ لڑائی شروع کر دی۔ اور قریش بھی اُن کی امداد پر اُتر آئے۔ آنحضرت صلعم کو اس واقعہ کی اطلاع ہوئی۔ تو آپ نے قریش کے پاس قاصد بھیجا۔ اور تین شرطیں پیش کیں کہ ان میں سے کوئی ایک منظور کی جائے:۔

۱۔ مقتولوں کا خون بہا دیا جائے۔ یا

۲۔ قریش بنو بکر کی حمایت سے دستبردار ہو جائیں یا

۳۔ اعلان کیا جائے کہ صلح نامہ حدیبیہ منسوخ ہو گیا۔

قریش نے تیسری شرط منظور کر لی۔ لیکن قاصد کے چلے جانے کے بعد انہیں سخت

ندامت ہوئی۔ اور انہوں نے ابوسفیان کو مدینے بھیجا۔ تاکہ صلح نامہ حدیبیہ کو تازہ کیا جائے۔ لیکن اُسے ناکام لوٹ آنا پڑا۔

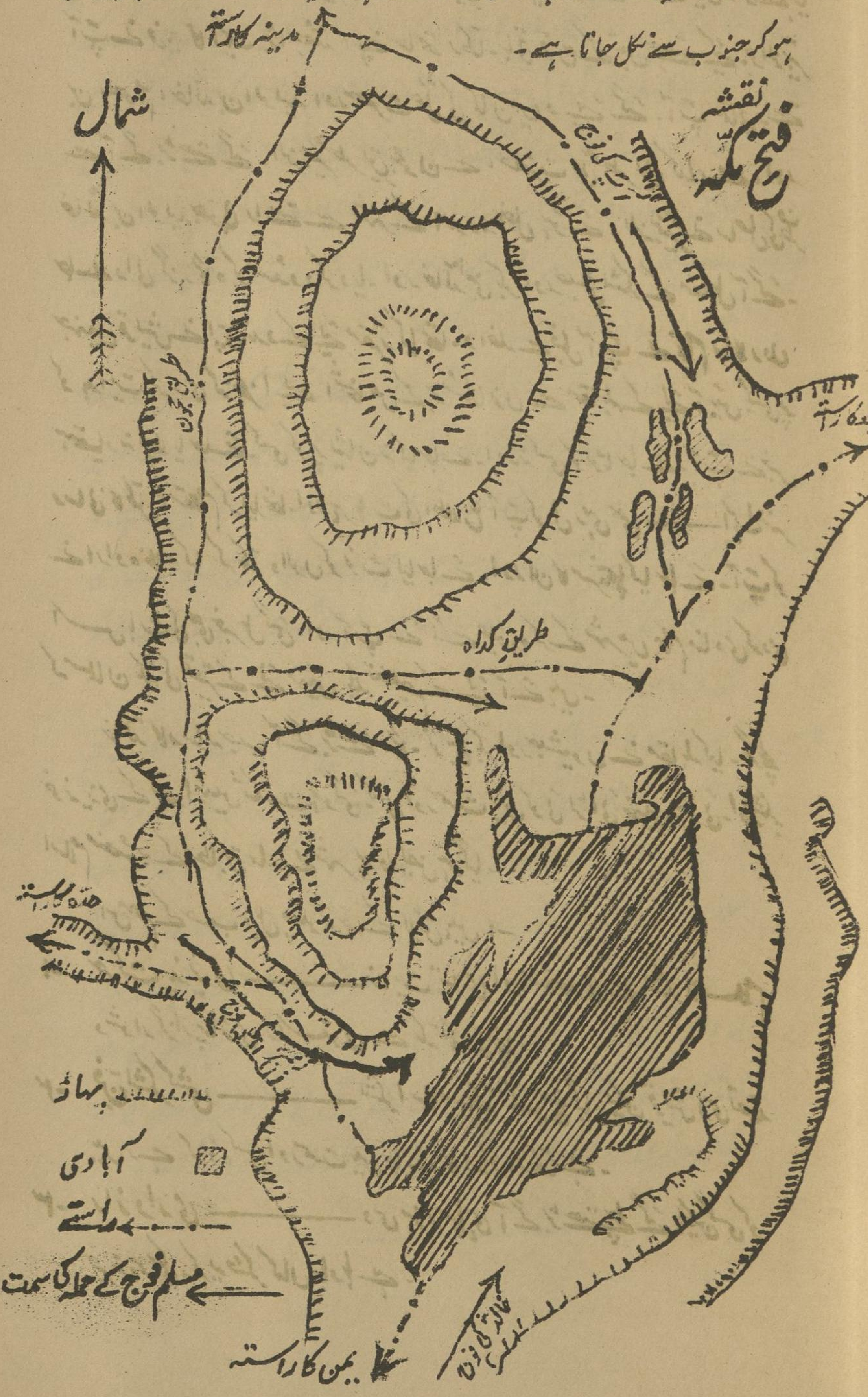
آنحضرت صلعم نے دس ہزار مجاہدین کا لشکر تیار کیا۔ اور نہایت پُر اسرار طریقے سے "حبس طریق" کرتے ہوئے مکے کی طرف روانہ ہوئے۔ آپ نے اپنا مقصد اپنی فوج پر بھی ظاہر نہیں کیا۔ بلکہ دکھاوے کے چکر لگا کر نامعلوم راستوں سے مکہ کی نواح تک پہنچ گئے۔

مکے کا سقوط

یہ رات کا وقت تھا۔ آنحضرت صلعم کے حکم پر ہر سپاہی نے آگ روشن کی۔ آن کی آن میں دس ہزار چولہے روشن ہوگئے۔ دُور سے قریش نے یہ منظر دیکھا۔ تو وُہ سخت پریشان ہوئے۔ اُنہوں نے سمجھا کہ جتنے چولہے ہیں۔ اُن سے کئی گُنا زیادہ سپاہی ہوں گے ـــــ ابوسفیان مُسلمانوں کی کھوج میں نکلا۔ لیکن مجاہدین کے کیمپ میں گھر گیا۔

قریش اس وقت بے سہارا تھے۔ ان کا بہترین افسر ابوجہل مر گیا تھا۔ اور دوسرے جرنیل مثلاً "خالدؓ اور عمروؓ مُسلمان ہو چکے تھے۔ انہیں کوئی مشورہ بھی نہیں مل سکتا تھا۔ اور نہ حلیفوں سے استمداد کا کوئی موقع حاصل تھا۔ وُہ اپنے حالات سے بھی عاجز آچکے تھے۔ مسلسل جنگوں اور ناکہ بندی سے اُن کی مُعاشی حالت خراب ہو چکی تھی۔ اور غلّہ کی عدم فراہمی کے باعث قحط کی سی صُورت پیدا ہو رہی تھی۔ ایسے میں ابوسفیان گھبرایا ہوا لوٹا اور قریش سے کہنے لگا۔ کہ اب مقابلہ بے سُود ہے۔ ہتھیار رکھ دینے ہی میں خیریت ہے۔ ورنہ کسی کی جان کا محفوظ رہنا مشکل ہے۔ ابوسفیان کے اس بیان سے قریش کے رہے سہے اوسان بھی خطا ہو گئے۔ اور اس عالم وحشت میں انہیں جب یہ معلوم ہوا۔ کہ آنحضرت صلعم نے عام معافی اور نرمی کا وعدہ فرمایا ہے۔ اور حکم دیا ہے کہ ابوسفیان کے گھر اور کعبے کے احاطے میں پناہ لینے والوں، ہتھیار ڈال دینے اور خانہ نشین ہونے والوں کو امن دیا جائے تو انہوں نے مزاحمت اور مقاومت کے ارادہ کو منسوخ کرکے شہر پر خاموشی سے مُسلمانوں کا قبضہ ہو جانے دیا۔

مکہ معظمہ دشوار گزار پہاڑوں سے محصور ہے۔ ایک بڑا راستہ شمال میں داخل ہو کر جنوب سے نکل جاتا ہے۔



دو چھوٹے راستے طریق جحون اور طریق کدار ایک بڑے راستے میں آکر ملتے ہیں آپ نے فوج کا ایک بڑا حصّہ اپنے ساتھ رکھا۔ باقی فوج کے تین حصّے کیئے۔ جو الزبیرؓ بن العوام، خالدؓ بن الولید اور حضرت علیؓ کی کمان میں دیئے گئے۔ آپ شمالی راستے سے آگے بڑھنے گئے۔ الزبیرؓ طریق جحون سے، حضرت علیؓ طریق کدار سے، اور خالدؓ بن الولید جنوبی راستے سے شہر کے اندر داخل ہوئے۔ الزبیرؓ نے ساحل کی طرف جانے والی گزرگاہ کو مسدود کر دیا۔ اور خالدؓ بنی بکر اور حبشی لشکر کے مقابل آگئے۔ جنہیں قریش نے اپنی مدد کے لیئے مقرر کیا تھا۔ داخلہ سے قبل آپ نے تمام سالاروں کو ہدایت کر دی کہ بجز ایسے اشخاص کے جو مسلمانوں سے مقابلہ کے لیئے آئیں کسی پر ہتھیار نہ چلایا جائے۔ کسی کو پریشان نہ کیا جائے۔ اور نہ کسی کو لوٹا جائے۔ آپ نے خبر رسانی کا مکمل انتظام کر لیا تھا۔ اور ہر بات کی اطلاع آپ کو مل رہی تھی —— ایک افسر نے ارادہ ظاہر کیا کہ مکّہ والوں کو لوٹ لیا جائے۔ اور ان کا سر نیچا کیا جائے۔ آپ کو اس بات کی بھی خبر مل گئی۔ اور آپ نے اُسے علیحدہ کر کے شہر میں تمام منادی کر دی کہ مسلمان مکّہ کی تحقیر کے لیئے نہیں بلکہ تعظیم کے لیئے آئے ہیں۔

خالدؓ کا رسالہ جب آگے بڑھنے لگا۔ تو بنی بکر اور حبشیوں نے مقابلہ کیا۔ مگر کچھ خونریزی کے بعد انہیں شکست ہو گئی۔ کسی اور سمت میں کوئی لڑائی نہیں ہوئی۔ اور لشکرِ اسلام منصوبہ کے مطابق سارے شہر پر قابض ہو گیا۔

اس مہم کے حسب ذیل پہلو توجّہ کے لائق ہیں :-

۱- **حرکت پذیری** —— نہایت تیزی اور مستعدی سے لشکرِ اسلام دشوار گزار پہاڑی راستوں سے مکّہ تک پہنچا۔

۲- **فنِ لشکر کشی** —— لشکرِ اسلام مکّے تک پہنچ گیا۔ لیکن قریش اسی تصوّر میں رہے۔ کہ وُہ کسی اور سمت میں جانے کا ارادہ رکھتا ہے۔

۳- **رازداری** —— دس ہزار سپاہی آگے بڑھتے چلے گئے۔ لیکن کسی کو خبر نہ ہو سکی۔ کہ یہ لشکر کہاں جا رہا ہے۔

۴۔ اچانک حملہ ——— مسلمان ایسی پھُرتی سے مکّہ تک پہنچ آئے کہ قریشِ مکّہ ششدر رہ گئے۔ اور اس اچانک فوج کشی کے باعث وُہ کچھ نہ کر سکے۔

۵۔ سپہ سالار کی کارکردگی ——— سالارِ مدینہ کی منصوبہ بندی کی بدولت فتح مکّہ کے لیئے اسباب فراہم ہو چکے تھے۔ اور شہر مکّہ ایک پکّے پھل کی طرح مُسلمانوں کی گود میں گرنے ہی کو تھا۔ آپ نے اس مہم میں بالواسطہ کارروائی (Indirect Approach) کی۔ جو عہدِ حاضر کے فنِ حرب میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اس کے مطابق دشمن کے علاقے میں پروپیگنڈہ کے ذریعے مخالف جذبات کو زائل اور مزاحمت کے ارادے کو کمزور کر دیا جاتا ہے۔ دُشمن کو اُس کے حلیفوں سے جدا کیا جاتا ہے۔ اس کے مُلک میں بے چینی پیدا کی جاتی ہے۔ اور اعصابی جنگ شروع کر کے اُن کے حوصلوں کو پست سے پست تر کر دیا جاتا ہے۔

اس مہم میں آنحضرت صلعم کی حربی صلاحیتوں ہی کی بدولت بغیر خونریزی کے ایسی عظیم الشان فتح حاصل ہوئی۔ جو تاریخ عالم میں فنِ جنگ کا عجیب و غریب نمونہ سمجھی جاتی ہے۔

۶۔ انسانیت کا احترام ——— فتح مکّہ کا اہم ترین پہلو یہ ہے کہ آنحضرت صلعم نے اس مہم میں کسی کو ذلیل و خوار نہیں کیا۔ اور نہ ہی کسی کے جان و مال اور عزت و آبرو سے تعارض کیا۔ آپ نے ثابت کیا کہ آپ کا منصب اصلاح و تعمیر تھا نہ کہ تخریب و انتقام، انسانی عظمت کا تحفظ تھا نہ کہ خونریزی و خون آشامی۔ یہی مقصد آپ کے پیشِ نظر تھا۔ جبکہ آپ نے صُلحِ حدیبیہ کے وقت مکّہ پر چڑھائی سے پرہیز کیا تھا۔ اور اسی غرض کے پیشِ نظر آپ نے ایک عظیم الشان لشکر کے ساتھ اچانک مکّے کو گھیر لیا۔ تاکہ قریشِ مکّہ لڑائی سے اجتناب کریں اور انسانی خون کے بہانے کی ضرورت ہی پیش نہ آئے۔

حنین اور طائف

مکہ فتح ہوا۔ رسولِ عربی کی زندگی کا اہم ترین معرکہ سر ہو گیا۔ لیکن حجاز کے کچھ اندرونی علاقے ابھی تک قابو میں نہیں آسکے تھے۔ اور وہاں خدائے واحد کی جگہ بتوں کی پرستش کا سلسلہ ابھی تک جاری تھا چنانچہ رسالت پناہ نے اسلام کی تبلیغ اور خدائے ذوالجلال کے احکام کی ترویج کے لیے مختلف سمتوں میں متعدد مہمیں روانہ کیں جن میں نخلہ اور رہاط کی مہمیں خاص طور پر اہمیت رکھتی ہیں۔ اول الذکر مہم کے لیے خالدؓ بن ولید اور ثانی الذکر کے لیے عمروؓ بن العاص کو روانہ کیا گیا۔ خالدؓ نے عزیٰ کے دیو کو سر کے بل گرا کر خدائے بلند و برتر کے نام کا بول بالا کیا۔ اور عمروؓ نے ھذیل کے بت کو پاش پاش کر کے بتکدہ پر اسلام کا جھنڈا لہرا دیا۔

جنگِ حنین

حنین کے صحیح محل وقوع کا اکثر جغرافیہ نگاروں کو بھی علم نہیں تھا۔ لیکن ڈاکٹر حمید اللہ[1] کی تحقیق کے مدِنظر یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ لڑائی جبل اوطاس کے دروں اور پر پیچ وادیوں میں کہیں ہوئی ہے۔ جبلِ اوطاس طائف کے شمال مشرق میں تیس چالیس میل پر واقع ہے۔ اور وادیٔ لیہ طائف کے مشرق میں کوئی بیس میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ آنحضرت صلعم مکے سے سیدھے طائف نہیں گئے۔ بلکہ توریہ (دکھاوا) کرتے ہوئے حنین پہنچے۔ اور پھر نخلۂ یمانیہ اور قرن سے ہوتے ہوئے لیہ آئے۔ اور وہاں سے آگے بڑھ کر طائف کی فصیل کے نیچے جا کھڑے ہوئے۔

اس کی تفصیل یہ ہے۔ کہ فتح مکہ کے بعد کوئی پندرہ دن گزرے تھے۔ کہ بنی ہوازن

---

[1] ملاحظہ ہو "عہدِ نبویؐ کے میدانِ جنگ" جو ڈاکٹر حمید اللہ کی ایک معرکۃ الآرا تصنیف ہے۔ ڈاکٹر صاحب پہلے جامعہ عثمانیہ میں قانون کے پروفیسر تھے۔ حیدر آباد دکن کی شکست کے بعد پیرس یونیورسٹی میں قانونِ بین الاقوام کے پروفیسر مقرر ہوئے ہیں۔

اور ثقیف کی جنگی تیاریوں کی اطلاع آپ کو ملی۔ آپ بارہ ہزار کے لشکر کے ساتھ شمال کی طرف بڑھے۔ اور پھر نصف دائرہ سا بناتے ہوئے حنین پہنچ گئے ــــــ لشکرِ اسلام حنین کے قریب ایک نہایت گہری وادی میں اُترتا چلا گیا۔ لیکن دشمن پہلے ہی سے وادی کے پیچ و خم میں چھپ کر تاک میں بیٹھا تھا چنانچہ مسلمانوں کو بے خبر پا کر اُس نے اچانک حملہ کر دیا۔ اکثر سپاہیوں کے قدم اُکھڑ گئے۔ لیکن سپہ سالارِ اسلام نے اپنی ذاتی شجاعت اور صلاحیت سے صورتِ حال پر قابو پا لیا۔ آپ نے اپنے صحابہ کو لے کر نہایت بے جگری سے لڑائی شروع کی۔ چند عورتیں بھی آپ کے ساتھ ہو گئیں۔ اور جب رفتہ رفتہ کافی فوج آپ کے اطراف جمع ہو گئی تو آپ نے جوابی حملہ کر دیا۔ مقابل کے نامور سردار مارے گئے۔ اور دشمن کا سارا لشکر بھاگ کھڑا ہوا کفار کے بیوی بچوں اور مال مویشی کو گرفتار کر کے بحفاظت تمام مکے کی طرف روانہ کر دیا گیا

محاصرۂ طائف معرکۂ حنین کے بعد آپ اوطاس سے گزر کر لیہ پہنچے۔ اور وہاں کی گڑھی کو منہدم کر کے طائف کی فصیل تک بڑھ آئے آپ نے طائف کا محاصرہ غیر متوقع سمت سے کیا۔ لیکن اہلِ شہر قلعہ بند ہو گئے۔ لشکرِ اسلام کے لئے قلعہ کے محاصرے کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ آنحضرت صلعم نے شہر کے سقوط کے لئے متعدد تدبیریں اختیار فرمائیں :۔

۱۔ منجنیق، دبابے اور عرادے اور اسی طرح کے قلعہ شکن آلات استعمال کیے گئے۔ لیکن اہلِ طائف کو جو محاصرہ کی مدافعت کا غالباً تجربہ رکھتے تھے۔ اُن سے کوئی خاص نقصان نہیں پہنچا۔ انہوں نے سخت مزاحمت جاری رکھی۔ اور دبابوں پر منڈھے ہوئے چمڑے کو دہکتی ہوئی فولادی میخوں سے جلا کر اور شدید تیر اندازی کے ذریعے مسلمانوں کے پے درپے حملوں کو ناکام کر دیا۔

۲۔ فصیل کے اطراف کانٹے بچھا دیئے گئے۔ تاکہ دشمن کی آمد و رفت میں دشواری پیدا ہو۔

۳۔ یہ اعلان کیا گیا۔ کہ دشمن کے ملک کا جو غلام بھاگ کر آئے اور اسلام قبول

کرلے۔ وہ آزاد سمجھا جائے گا۔ اس اعلان سے ایک حد تک فائدہ ہوا۔

۴۔ معاشی دباؤ ڈالنے کے لیے دھمکی دی کہ قلعہ کے باہر تمام باغوں کو تباہ کردیا جائے گا ــــــ لیکن آپ کی رسالت اور پیغمبری جو خدا کی رحمتوں کو ساتھ لے کر آئی تھی ایسی تباہی کی متحمل نہیں ہوسکتی تھی۔ اس لیئے آپ ہی کے حکم سے باغوں کی قطع و برید روک دی گئی۔

طائف ایک مالدار شہر تھا۔ جس میں خورونوشس کی اشیاء کی کوئی کمی نہیں تھی۔ چنانچہ محاصرہ پندرہ دن تک جاری رہنے کے باوجود کوئی بے چینی کے آثار اندرونِ شہر نمودار نہیں ہوئے۔ دوسری طرف لشکرِ اسلام کے وسائل[1] ایسے ضرور تھے کہ محاصرے کو طویل عرصہ تک جاری رکھا جاسکتا تھا۔ لیکن اس کا نتیجہ محصورین کی تباہی اور فاقہ کشی اور انسانیت کی بربادی کے سوا کچھ نہ ہوتا۔ انہی وجوہ سے آنحضرت صلعم محاصرہ اُٹھا کر واپس ہوگئے۔ اور اوطاس پہنچ کر مالِ غنیمت کی تقسیم کی۔ کچھ عرصہ بعد اہلِ ہوازن کا وفد آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ جس کی درخواست پر آپ نے اُن کے بیوی بچوں کو واپس کردیا۔ آپ کی اس فراخدلی نے بوقت واحد اہلِ ہوازن کو متاثر بھی کیا۔ اور طائف کے باشندوں سے انہیں الگ بھی کردیا۔ چنانچہ اہلِ طائف جن کے اطراف اسلامی اثرات دن بدن وسیع تر ہوتے جارہے تھے۔ اپنے حالات سے پریشان ہوئے اور ایک سال کے اندر دربارِ رسالت مآبؐ میں ... سمجھونہ کے لیئے حاضر ہوگئے انہوں نے چاہا کہ تین سال تک اُن کے بُت لات کو نہ توڑا جائے لیکن سرورِ کائناتؐ اس پر رضامند نہیں ہوئے۔ بالآخر وہ اسلام لے آئے۔ اور لات کو پاش پاش کرکے تمام مسلمانوں کے بھائی ہوگئے۔

ان معرکوں میں حسب ذیل امور توجہ کے لائق ہیں :۔

---

[1] جنگِ حنین میں مسلمانوں کو چوبیس ہزار اونٹ، چالیس ہزار بکریاں، چار ہزار اوقیہ چاندی اور چھ ہزار اسیرانِ جنگ حاصل ہوئے۔

۱۔ منصوبہ —— اہلِ طائف کو جنگ کی صورت میں اہلِ ہوازن کی مدد حاصل تھی۔ اس لیئے مکے کی سمت سے طائف پر حملہ مناسب نہیں تھا۔ چنانچہ آپؐ نے پہلے اہلِ ہوازن کو مغلوب کیا۔ اور پھر طائف کے محاصرے کے لیئے قدم اٹھایا۔

۲۔ توریہ اور اچانک حملہ —— آپؐ نے دشمن کو آخر وقت تک غافل رکھا۔ پہلے آپؐ شمال کی طرف بڑھے۔ تاکہ اہلِ ہوازن اور باشندگانِ طائف کو آپؐ کی نقل و حرکت کا مقصد معلوم نہ ہو سکے۔ اور پھر مشکل راستوں سے نصف دائرہ سا بناتے ہوئے حنین پہنچے۔ اس معرکہ کو سر کرنے کے بعد اچانک ایسی سمت سے طائف کی فصیل تک چلے گئے کہ جس کا وہم و گمان بھی وہاں کے رہنے والوں کو نہیں ہو سکتا تھا۔

کلاز وِٹز کا قول ہے کہ "اچانک حملہ دشمن پر غلبہ حاصل کرنے کا بہت اچھا ذریعہ ہے" اور بڑے بڑے جرنیل اپنی فتوحات کے لیئے اِسی کے رہینِ منت ہیں۔

رات کے وقت اچانک حملہ سے بہت زیادہ فائدہ ہو سکتا ہے لیکن ایسی صورت میں خطرات بھی پنہاں ہوتے ہیں۔ کیونکہ رات کے وقت دشمن کی تیاری اور جغرافیائی موقف کا صحیح اندازہ مشکل ہوتا ہے۔

اچانک حملہ کی تیاری کو انتہائی راز میں رکھنا پڑتا ہے۔ درحقیقت ایسا حملہ اپنی تکنک کے لحاظ سے بہت دشوار ہوتا ہے۔ وقت کی پابندی، خود اعتمادی اور یقینِ محکم اس کے لازمی اجزا ہیں۔

دوسری جنگِ عظیم میں رومل اور منٹگمری دونوں اس اصولِ جنگ سے فائدہ اُٹھانے کی سعی کرتے رہے۔ ماہِ اکتوبر ۱۹۴۲ء میں العلمین کے مقام پر رومل نے چاہا۔ کہ وہ متحدین پر اچانک حملہ کر دے۔ لیکن اپنی تیاریوں کے باوجود وہ اپنی اس کوشش میں ناکام رہا۔ دوسری طرف منٹگمری بھی موقع کی گھات میں رہا۔ اور حالات کے سازگار ہوتے ہی جرمنوں پر اچانک حملہ کر کے جنگ جیت گیا۔

۳۔ سیاسی تدبر —— حنین کی جنگ میں اہلِ ہوازن مغلوب ہو چکے تھے

لیکن طائف سے لوٹنے پر آپ نے اُن کی درخواست پر اُن کے بیوی، بچے واپس کر دیئے۔ اس عمل سے آپ نے نہ صرف اُن کے دل موہ لیئے بلکہ اہلِ طائف کو آئندہ کے لیئے اُن کی مدد اور ہمدردی سے محروم بھی کر دیا۔ اور اس طرح ان دونوں گروہوں کو ذہنی اور اخلاقی شکست ہو گئی۔

۴- احترامِ انسانیت ——— محاصرۂ طائف کا مقابلہ دُنیا کے قدیم محاصروں سے کیا جائے۔ تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ آنحضرت صلعم انسانیت کے لیئے فی الحقیقت خُدا کی رحمت بن کر آئے تھے۔ واقعات اور شواہد سے ظاہر ہے کہ اسلامی فوج ایک طویل عرصہ تک محاصرہ جاری رکھنے کے موقف میں تھی جنگِ حنین میں وُہ فتح یاب ہو چکی تھی۔ اُس کے حوصلے بلند تھے۔ اور کثیر مالِ غنیمت بھی اُس کے ہاتھ آیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود آنحضرت صلعم نے پندرہ ہی روز میں محاصرہ اُٹھا لیا ——— کیوں؟

قیاس کہتا ہے کہ دُنیا میں آغازِ جنگ کے ساتھ ہی محاصرہ کا رواج ہو گیا ہو گا! اور شہری زندگی کی ابتدا ہی میں طاقتور قوموں، نسلوں اور قبیلوں کو محاصرے کی ترغیب ہُوئی ہو گی ——— ایسے محاصروں میں بالعموم یا تو محصُورین غلّہ اور پانی کی کمی، فاقہ کشی اور وباؤں کے خطرہ کے سبب سے گھُٹنے ٹیک دیتے۔ یا محاصرین وسائل کے ختم ہو جانے کی وجہ سے محاصرہ اُٹھا لیتے۔ یا سخت جنگ کے بعد شہروں کا سقوط ہوتا۔ فصیلیں تباہ کر دی جاتیں۔ باغات کاٹ لیئے جاتے اور شہریوں کا قتلِ عام ہوتا ——— ! ہومر نے اپنی مشہور نظم "الیڈ" میں ایک محاصرہ کا ذکر کیا ہے۔ جو زمانۂ قدیم کا ایک بہت بڑا معرکہ اور تاریخ حرب کا ایک عظیم الشان محاصرہ تھا۔ جس کے متعلق خونریزی و غارت گری کے ہولناک واقعات ہومر بیان کرتا ہے۔

قرونِ اولیٰ کی تاریخ میں بھی متعدد ہیبت ناک محاصروں کا ذکر موجود ہے ان میں یروشلم کا محاصرہ بڑی اہمیت کا حامل ہے ——— سنہ کے اوائل

میں روم کے شہنشاہ طیطس نے ایک عظیم الشان لشکر کے ساتھ شام پر چڑھائی کی۔ اور بیت المقدس کو گھیر لیا۔ جس کی تین شہر پناہیں یکے بعد دیگرے موجود تھیں۔ اور ہر شہر پناہ مدافعت کا مکمل انتظام رکھتی تھی۔ اس لحاظ سے یہ شہر بہت محفوظ تھا۔ لیکن رومی بھی اس محاصرے کے لیے تیار ہو کر آئے تھے۔ اُن کے پاس طویل گرز، سنگ بار منجنیقیں، آتش فشاں منارے اور کبش موجود تھے۔ شہر کے اطراف بے شمار باغات تھے۔ جن کو رومیوں نے سرے سے کاٹ ڈالا۔ محاصرہ طویل عرصہ تک جاری رہا یہودیوں نے جم کر مقابلہ کیا۔ اور اپنی ساری صلاحیتیں مدافعت کے لیئے مرکوز کر لیں۔ انہوں نے زمین دوز سرنگوں کے ذریعے رُومیوں کو دو مرتبہ کثیر نقصان پہنچایا۔ لیکن ہر نوبت پر رُومیوں کا غیض و غضب بھڑکتا ہی گیا۔ اور جوشِ انتقام سے وُہ دیوانہ وار آگے بڑھتے ہی گئے۔ انہوں نے اپنی عظیم الشان منجنیقوں اور بڑے بڑے کبش کے ساتھ آخری حملہ بول دیا۔ اُن کا سیلاب ہلاکت و بربادی پھیلاتا ہُوا آخری شہر پناہ تک پہنچ گیا۔ اور ایک روز صبح یہودیوں نے دیکھا۔ کہ رُومیوں کا خونیں لشکر قتل و غارت کے ہتھیار سے مسلح ہو کر قلبِ شہر میں داخل ہو گیا ——— پھر وُہ سب کچھ ہُوا۔ جس کے تصور ہی سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور آسمان خُون برسانے لگتے ہیں۔ قتل و خونریزی، عصمت دری و غارت گری کا سلسلہ ہفتوں اِس مقدس شہر میں جاری رہا۔ جوان اور بُوڑھے، عورتیں اور بچے یکساں طور پر تہہ تیغ کر دیئے گئے۔ عمارتیں جلا دی گئیں۔ اور دیواریں زمین کے برابر کر دی گئیں۔ جو بچ گئے۔ وُہ غلام بنا لیئے گئے۔ اور جو راہِ فرار اختیار کر گئے۔ وُہ عمر بھر اپنے شہر کی تباہی کے دردناک فسانے سُنتے رہے ———!

آنحضرت صلعم بھی تمام باغات کو تباہ کر کے اہلِ طائف کو مرعوب اور مجبور کر سکتے تھے۔ آپ کو بھی قلعہ شکن آلاتِ حرب فراہم ہو گئے تھے۔ اور محاصرہ کو طویل عرصہ تک جاری رکھنے کے لیئے وسائل موجُود تھے۔ لیکن آپ نے ہر اُس فعل

ﮯ: خیبر میں منجنیق بطور مالِ غنیمت ہاتھ آئی تھی۔ اور اس کے بعد کئی منجنیقیں تیار بھی کرائی گئی تھیں۔

سے اجتناب کیا۔ جو غیر ضروری نقصان اور خونریزی کا باعث ہو سکتا تھا۔ آپ کو قرآنی صداقتوں پر اعتماد تھا۔ انسانیت اور انسانی خون کی حرمت کا پاس تھا۔ اور خدائے ذوالجلال کو یہ منظور تھا کہ رحمت اللعالمین کی صداقت کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جریدۂ عالم پر ثبت کر دیا جائے ———!

غزوۂ تبوک

رومی سلطنت عرب پر حملہ کا عزم کر رہی تھی۔ قیصر رُوم نے شام کے غسانی خاندان کو جو عیسائی تھا اس مہم کے لیئے آمادہ کر لیا تھا۔ شام کے سوداگروں کے ذریعے مدینے میں یہ خبریں پھیلتی جا رہی تھیں۔ یہ اطلاع بھی عام ہو گئی تھی۔ کہ غسان کا مقدمۃ الجیش بلقاء تک آگیا ہے۔ اور ہرقل نے چالیس ہزار فوج روانہ کر دی ہے۔ ان خبروں سے سارے عرب میں بے چینی پھیل گئی۔ اور لوگوں کی نگاہیں ذاتِ گرامی پر مرکوز ہو گئیں۔ آپ نے جہاد کی تیاری کا حکم دے دیا۔ اور اپنے دستور کے خلاف اس بات کا اعلان کر دیا۔ کہ لشکرِ اسلام کو تبوک[1] جانا ہے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ حریف کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ سفر طویل تھا۔ اور لشکریوں کو مناسب انتظام کا موقع ملنا ضروری تھا۔ نیز ملک میں قحط تھا۔ اور مدینے ہی سے جملہ ضروریات کا فراہم کیا جانا لازمی تھا۔ اس اعلان کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ سلطنتِ رُوم کے جلال و جبروت کا اثر ابھی تک اہلِ عرب کے دلوں پر باقی تھا۔ اور آنحضرت صلعم کا منشار یہ تھا۔ کہ مجاہدینِ اسلام کو پہلے ہی سے ذہنی طور پر اس مہم کے لیے آمادہ کیا جائے۔

اس جہاد کے لیئے اکثر صحابہ نے دل کھول کر چندہ دیا۔ تاہم بہت سے مجاہد جو سفر کا سامان نہیں رکھتے تھے۔ آپؐ کے ساتھ نہیں جا سکے۔ اس کے برعکس منافقین جو بظاہر اسلام کا دعویٰ کرتے تھے۔ اس مہم پر جانے سے جی چُرانے لگے۔ اور دوسروں کو بھی منع کرنے لگے کہ ایسی سخت گرمی میں باہر جانا عقلمندی نہیں ہے۔

سرورِ دو عالم نے مدینے میں حضرت علیؓ کو اپنا نائب مقرر کیا۔ اس غزوہ میں۔ ازواجِ مطہرات ساتھ نہیں تھیں۔ اس لیئے اہلِ حرم کی حفاظت کے لیے کسی عزیز خاص کا

---

[1]: تبوک ایک مشہور مقام ہے جو مدینے اور دمشق کے وسط میں مدینے سے چودہ منزل ہے۔

مستقر پر رہنا ضروری تھا۔ حضرت علیؓ نے شکایت کی کہ مجھے عورتوں اور بچوں میں چھوڑا جا رہا ہے۔ تو آپؐ نے فرمایا کہ "تم اس پر راضی نہیں ہو کہ تم کو مجھ سے وُہ نسبت ہے۔ جو ہارونؑ کو موسیٰؑ سے تھی"۔

آپؐ تیس ہزار کا لشکر لے کر روانہ ہو گئے۔ جس میں دس ہزار گھوڑے تھے۔ راستے میں بنی خزرج اور بنی قینقاع کے کچھ سردار آپؐ کا ساتھ چھوڑ کر واپس ہو گئے۔ لیکن بہت سارے مسلمان جو آپؐ کے ساتھ مدینے سے نہیں جا سکتے تھے۔ کسی نہ کسی طرح آپؐ سے جا ملے۔ اور دشوار منزلیں طے کرتے ہوئے آپؐ کے ہمراہ تبوک پہنچ گئے۔ وہاں معلوم ہوا کہ ہرقل کی افواج کی لشکر کشی کی خبر صحیح نہیں تھی۔ لیکن یہ خبر اصلیت سے بالکل خالی بھی نہیں تھی۔ کیونکہ عرب میں غسانی رئیس کی مسلسل ریشہ دوانیاں جاری تھیں۔

تبوک میں آپؐ نے بیس روز قیام فرمایا۔ جنوا ایلیہ کے رئیس یوحنا نے حاضر خدمت ہو کر جزیہ دینا منظور کیا۔ اس کے بعد جرباء اور اذرح کے عیسائی بھی حاضر ہوئے اور باقاعدہ تحریر لکھ کر جزیہ پر رضامندی ظاہر کی۔ دومۃ الجندل دمشق سے پانچ منزل پر ہے۔ وہاں کا عربی سردار اکیدر قیصر کے زیر اثر تھا۔ آنحضرت صلعم کے حکم پر خالدؓ چار سو کی جمعیت کے ساتھ دومۃ الجندل پہنچے اور اکیدر کو گرفتار کر کے لوٹے۔ آنحضرت صلعم نے اس شرط پر اسے رہا فرمایا۔ کہ وُہ خود دربارِ مدینہ میں حاضر ہو کر شرائط صُلح پیش کرے۔ اس کے بعد آپؐ مدینے کو مراجعت فرما ہوئے۔ جہاں عوام نے بڑے جوش و خروش سے آپؐ کا استقبال کیا۔

غزوۂ تبوک کے بڑے دوررس نتائج برآمد ہوئے۔ اس کے بعد متعدد اُمراء و رؤسا نے اسلام قبول کیا ——— آپؐ نے بنی حارث بن کعب کے مقابلہ کے لیے ایک دستہ خالدؓ کی سرداری میں بھیجا۔ لیکن دشمن نے بغیر لڑائی کے اسلام قبول کر لیا۔ اسی طرح حضرت علیؓ کی سرکردگی میں خالد کو یمن روانہ فرمایا۔ وہاں عوام نے حضرت علیؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ پھر متعدد قبائل کے وفود دربارِ رسالت پناہ میں حاضر ہوئے اور دُور دُور تک کا علاقہ اسلامی حلقۂ اثر میں آ گیا ———!

حربی نقطۂ نظر سے یہ مہم بوجوہ ذیل اہمیت رکھتی ہے :-

۱۔ آپ نے خلافِ معمول اپنی منزلِ مقصود کا اعلان کیا۔ اس کا بہت اچھا اثر مترتب ہُوا۔ دُشمن کو یقین نہ آسکا۔ کہ واقعی آپ تبوک کی طرف بڑھنا چاہتے ہیں۔ اس لیئے اُس نے مقابلہ کی کوئی تیاری نہیں کی نتیجتاً لشکرِ اسلام کے غیر متوقع ورود سے دُشمن کے چھکے چھوٹ گئے اور اُس نے بغیر لڑے بھڑے جزیہ کی شرط تسلیم کر کے صُلح کر لی۔

۲۔ اس مہم میں خون کا ایک قطرہ بھی نہیں بہا۔ لیکن اس کے باوصف فتح و نصرت کے تمام فوائد آپ کو حاصل ہو گئے۔ اس کی وجہ آپ کی پُر اسرار نقل و حرکت تھی۔

۳۔ اس مُہم سے لشکرِ اسلام کی بہترین تربیت ہو سکی۔ کیونکہ سخت گرمی کے موسم میں دُشوار گزار راستوں سے اُسے گزرنا پڑا۔

۴۔ اس مُہم سے سپاہیوں کی اخلاقی حالت پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ رُومیوں کی سطوت و جبروت کا سکہ ایک عالم پر بیٹھا ہُوا تھا۔ اُن کی افواج کی کثرت اور وسائل کی افراط کی خبریں سارے عرب میں پھیل رہی تھیں ——— اور ایسی عظیم الشان فوج کے مقابلہ میں مدینے کے غریب جن میں سے اکثر کے پاس سواری تک نہیں تھی اسلام کے لیے سینہ سپر ہو گئے تھے ——— اُن کے دل بیتاب تھے۔ رگوں میں خُون کھول رہا تھا۔ اور خُون میں حمیّتِ اسلامی جوش کھا رہی تھی۔ اُن میں سے اکثر جو میدانِ جنگ کی طرف جانے کے لیے وسائل بھی نہیں رکھتے تھے۔ آنحضرت صلعم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور اس طرح پھُوٹ پھُوٹ کر روئے۔ کہ آپ کا دل بھر آیا۔ عرش میں لرزہ پڑ گیا۔ اور تبارک و تعالیٰ اُن کی دلجوئی کے لیے کہہ اُٹھا کہ :-

"اور نہ ان لوگوں پر کچھ اعتراض ہے کہ جب تمہارے پاس آئے کہ ہم کو سواری دیجیے اور تم نے کہا۔ کہ میرے پاس سواری کہاں؟ جس پر تم کو سوار کر سکوں۔ تو وہ واپس گئے اور ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ کہ افسوس ہمارے پاس خرچ نہیں ہے" ——— (توبہ)

اوراقِ گذشتہ پر ایک نظر

اس باب میں کسی جگہ جنگ کے اجزائے ترکیبی پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ اور اس امر کی وضاحت کی گئی ہے کہ ہر جنگ کا انحصار بڑی حد تک سپہ سالار اور سپاہیوں کی صلاحیت اور اخلاقی حالت پر ہوتا ہے —— آنحضرت صلعم کی جنگیں اس حقیقت پر مہرِ تصدیق لگاتی ہیں۔ کہ وسائل اور افواج کی کثرت کسی دُور اندیش سپہ سالار اور کفن بدوش لشکر کے مقابلہ میں بے معنی ہو جاتی ہے۔

سپاہی

اوپر بتایا گیا ہے کہ رسولِ عربی نے مخصوص انداز میں مجاہدینِ اسلام کی ذہنی، اخلاقی اور عملی تربیت کی تھی۔ جس کی بدولت اُن کی قدریں بدل گئی تھیں۔ موت کی ہیبت اُن کے دل سے زائل ہو چکی تھی۔ اور مشکلات کا کوئی تصور اُن کے نزدیک باقی نہیں تھا۔ انہیں اپنے سالار سے محبت تھی۔ اُس کی شخصیت سے عشق تھا۔ اُس کے حکم پر خون بہانا اُن کے لیے باعثِ افتخار اور اس کے ابرو کے اشارے پر متاعِ حیات کو لٹا دینا باعثِ نجات تھا —— محمدؐ عربی کے سپاہی نے صبر آزما حالات میں بھی سکندرِ اعظم کے سپاہی کے برعکس آگے بڑھنے سے انکار نہیں کیا۔ اُس نے حضرت موسیٰؑ کے سپاہی کی طرح اپنے سالار سے یہ نہیں کہا۔ کہ دشمن قوی ہے۔ "تم اپنے خدا کے ساتھ جاؤ اور اُس کا مقابلہ کرو"۔ بلکہ وہ اپنے سالار سے پروانہ وار لپٹا رہا۔ اور ہر نوبت پر باوازِ بلند کہتا رہا کہ :-

> "یا رسول اللہ! ہم آپؐ کو وہ جواب نہ دیں گے۔ جو موسیٰؑ کی قوم نے موسیٰؑ کو دیا تھا کہ تم اپنے خدا کے ساتھ جاؤ اور لڑو —— بلکہ ہم آپؐ کے دائیں، آپؐ کے بائیں، آپؐ کے آگے، آپؐ کے پیچھے، غرض ہر طرف سے جمع ہو کر اور قدم بقدم ہو کر لڑیں گے۔ اور اپنی جانوں کو آپؐ پر نثار کریں گے"

(بخاری) —— (۱۲۷ : ۶) : ۵

اور یہی جوشِ عقیدت تھا کہ غزوۂ اُحد کی ہلاکت خیزیوں میں حضرت طلحہؓ کا ہاتھ آپ کو بچانے کی کوشش میں کٹ گیا۔ اور جب تیروں کی بارش میں آپ نے سر اُٹھا کر لشکرِ کفار کو دیکھنا چاہا۔ تو ابو طلحہؓ کی جاں نثاری نے للکار کر :-

"یا محمدؐ! سر نہ اُٹھائیے۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی تیر لگ جائے۔ جب تک ابو طلحہؓ کا سینہ آپ کے لیے سپر بنا ہوا ہے۔ کوئی تیر آپ کے سینے کو چھو نہیں سکے گا۔"

غزوات کی تاریخ عشقِ رسولؐ اور خدا پرستی کا ایک نہایت روشن اور تابدار مرقع ہے جو عساکرِ محمدیؐ نے دُنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔ اُنھوں نے اپنی شجاعت اور پامردی سے آنیوالی نسلوں کو زندگی بخشی ہے۔ اور سرفروشی کی ایک نہ مٹنے والی نظیر ابد تک کے لیئے قائم کر دی ہے ——— فی الحقیقت جو لوگ اس دُنیا میں مرنے کے لیے تیار رہتے ہیں وُہی مردوں کو زندگی بھی بخش سکتے ہیں۔ لیکن جو صرف اپنی خاطر زندہ رہتے ہیں وُہ اپنی ملت کے لیے ایک بار ہوتے ہیں، ایک مُردہ لاش اپنی قوم کے لیے بن جاتے ہیں۔

محمدؐ عربی کے سپاہیوں کی سرگزشت ایک صدائے موعظت ہے جو بتلاتی ہے کہ رسُولِ عربی کے مقامِ بلند اور قرآنی حقائق کی قدر و قیمت کو سمجھیں۔ اور خدا کی راہ میں شہادت کی محبوبیت اور معشوقیت کا اندازہ کریں۔ اُن کی تاریخ اُن قوموں کے لیے شاہراہِ عمل کا افتتاح کرتی ہے جو انسانی ہیبت و سطوت سے مرعوب ہو جاتی ہیں۔ اور قوائے جنگ و اسباب تسلط سے ہمت ہار کر بیٹھ جاتی ہیں۔ اُنہوں نے ہمیشہ کے لیے اس بات کا فیصلہ کر دیا ہے۔ کہ قوموں کی زندگی اور ملتوں کی رفعت صرف اسلحہ اور وسائل جنگ کے حصُول ہی پر موقوف نہیں ہے۔ بلکہ دلوں کے محکم جوش، صورتِ حال کی نزاکت کے سچے احساس، مستعدی اور آمادگی کی صداقت، باہمی نزاعوں اور بے مہریوں کے استیصال؛ اتحاد و اتفاق کی برکات ہی میں مضمر ہے۔ پھر نہ فوجوں کی کثرت مؤثر ہوتی ہے نہ مادی اسباب و وسائل کی احتیاج رہتی ہے۔ نہ ہتھیاروں کے چھوٹ جانے سے نقصان پہنچ سکتا ہے اور نہ انسانی جلال و جبروت سے قوت سلب ہو سکتی ہے!

رسُولِ عربی کے سپاہیوں کے دل قوت اور طاقت کی نئی رُوح سے بھرے ہُوئے

تھے۔ ان کے قلوب سے دشمن کی قوت، تسلط، وسائل اور کثرتِ تعداد کا رعب زائل ہو چکا تھا۔ وہ کفن بدوش تھے۔ سر بکف تھے ـــــ اور شمعِ رسالت کے یہ پروانے شمع کی لو پر جل مرنے کو تیار ہو چکے تھے ـــــ اور جو قوم مرنے کے لیے مستعد ہو جائے وہ ناممکن کو ممکن بنا سکتی ہے۔ اور دنیا کی کوئی قوت اسے مغلوب نہیں کر سکتی!

بہر حال عساکرِ محمدی نے بدر کی ظفر مندیوں میں اور احد کی ہزیمتوں میں دنیا کو یہ بتایا کہ عسکریت کی روح تلوار کے چمکتے ہوئے جوہر میں پیدا نہیں ہوتی۔ اس کا آشیانہ شہسواروں کے خودوں میں نہیں ہے وسائلِ جنگ پر اس کی پرورش نہیں ہوتی چمکیلے زرہ پر وہ پروان نہیں چڑھتی۔ بلکہ اس نے ان تمام قیود سے آزاد ہو کر صرف سپاہیوں کے دل ہی کو اپنا گھر بنایا ہے۔ جہاں مقصد کی محبت اور رب تعالیٰ کے عشق ہی سے اس کے معجزات کا اظہار ہوتا رہتا ہے یہی عشق تھا جس نے بدر میں افواج کی فراوانی کو نظرِ حقارت سے دیکھا۔ اسی نے حنین میں تیروں کی بوچھاڑ کو بارش کے قطروں سے زیادہ اہمیت نہیں دی۔ اور پھر سوچیے کہ یہی عشق تھا جس نے حضرت ابراہیمؑ کو آتشِ نمرود کے شعلوں میں بے تکلف بھیجدیا۔ اور اسی کے معجزے نے حضرت حسینؓ کی استقامت اور شجاعت پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مہرِ تصدیق ثبت کردی!

صدقِ خلیل بھی ہے عشق صبرِ حسینؓ بھی ہے عشق
معرکۂ حیات میں بدر و حنین بھی ہے عشق

سپہ سالار

لیکن معرکۂ کارزار میں سپہ سالارِ اسلام کو بھی دیکھیے کہ شجاعت اور عزم و استقلال کی سنہری زنجیر اس کے پاؤں میں پڑی ہوئی ہے بڑی احتیاط سے وہ جنگ کا منصوبہ تیار کرتا ہے۔ دشمن کی نقل و حرکت پہ گہری نظر رکھتا ہے اور پھر اس طرح اپنے سپاہیوں کو لڑاتا ہے کہ دشمن کے تجربہ کار جرنیل انگشت بدنداں ہو جاتے ہیں۔ اور ایک بے سروسامان جمعیت کو لشکرِ جرار پر فتح و نصرت حاصل ہو جاتی ہے ـــــ اس سپہ سالار کی سیاہ آنکھوں میں مقناطیس کی کشش ہے۔ برق کی روشنی ہے ـــــ ایک چمک ہے نایاب! یہ کشش اس کی شخصیت کی جاذبیت ہے۔ یہ روشنی اس کی ذہانت کی شاہد ہے۔ اور یہ چمک اس کے تابناک ضمیر کی آئینہ دار!

اس کی نگاہیں اُس کی بے پناہ قوتِ ارادی کو دشمن پر مرکوز کرکے اُسے مرعوب اور مسخر کر لیتی ہیں۔ اور یہی وُہ خُداداد طاقت ہے۔ جو عظیم الشان لشکروں کو بے بس کر دیتی ہے ہولناک آندھیوں کو سلا دیتی ہے۔ اور ہیبتناک طوفانوں کے رُخ پھیر دیتی ہے۔ بدر کا معرکہ ہے۔ تین سو "نہتے" مُسلمانوں کو ایک ہزار مسلح لشکر کا مقابلہ کرنا ہے۔ نگران تین سو سپاہیوں کا سردار فوج کے انتظامات میں منہمک ہے۔ وُہ میدانِ جنگ کا مُعائنہ کرتا ہے۔ صفوں کو استوار اور سپاہیوں کے حوصلوں کو بڑھاتا ہے۔ اور پھر آسمان کی طرف ہاتھ اُٹھا کر کہتا ہے۔ کہ :۔

"خداوندا! اگر آج یہ چھوٹی سی جماعت صفحۂ ہستی سے مٹ گئی تو پھر کوئی تیرا پرستار اس دُنیا میں باقی نہیں رہے گا۔"

لیکن اس کی پیشانی پر کوئی بل نہیں ہے۔ وُہ زندگی اور موت سے بالاتر ہے "تکلیف و راحت اور رنج اور مسرت کی قدروں سے بلند تر ـــــــ اس کو دشمن کی کثرت اور طاقت کی فکر نہیں ہے۔ موت کی کوئی ہیبت نہیں ہے ـــــــ میدانِ احد میں مسلمانوں کے "قدم" اُکھڑ جاتے ہیں۔ مگر موت و حیات کے دوراہے پر وُہ ایک چٹان کی مانند کھڑا ہے "تلواروں اور نیزوں کے حملے ہو رہے ہیں۔ پتھر کی بارش ہو رہی ہے۔ تیروں کے مینہ برس رہے ہیں۔ خود کی کڑیاں سرِ مبارک میں دھنس گئی ہیں۔ دندانِ مبارک شہید ہو گئے ہیں۔ چہرۂ اقدس زخمی ہو رہا ہے ـــــــ لیکن اُس کے چہرے پر زندگی باقی ہے۔ اُس کی شخصیت کی جاذبیت اور رچاؤ باقی ہے ـــــــ اور پھر حنین کے میدان میں دفعتاً "دس ہزار تیروں کا مینہ برستا ہے، تھوڑی دیر کے لیے مسلمان پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ مگر مسلمانوں کا سالار اپنی جگہ یقینِ محکم کے ساتھ کھڑا رہتا ہے۔ وُہ ایک سچے خُدا کے سچے رسُول کے وقار کے ساتھ کھڑا رہتا ہے جیسے برق کی توانائیاں مرتکز ہو گئی ہوں جیسے آندھیوں کی تندی ایک نقطہ پر سمٹ آئی ہو۔ جیسے طوفان کی تیزی متشکل ہو گئی ہو۔ جیسے معجزات کی تاریخ مجسم ہو گئی ہو۔ جیسے خُدائے قہار کی قوتِ ارادی انسانی رُوپ میں آ گئی ہو ـــــــ!

قوانینِ جنگ

(تیسرا باب)

محمدؐ عربی کے درد مند دل سے رحمت کی گھٹائیں اٹھتی ہیں۔ اور فضا کی پریشانی کو رفع کر کے انسانی قصور کی پردہ داری کرتی ہیں۔ اُس کا عفوِ عام وحشت کو دُور کرتا ہے۔ حیاتِ نو کا پیغام دیتا ہے۔ اور انسانی قلوب کو انسانی خوف سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آزاد کر دیتا ہے!

قوانینِ جنگ

جنگ کے قدیم طریقے

ہم نے میدانِ جنگ میں رسُولِ عربیؐ کی فنی مہارت اور شجاعت کا جائزہ لیا۔ اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ آپ نے قوانینِ جنگ میں کیا اصلاح فرمائی ہے

عرب

آپ سے پہلے عرب میں مقاصدِ جنگ کی طرح جنگ کے طریقے بھی وحشیانہ تھے۔ جنگ کی خصُوصیت یہ تھی کہ وُہ ہولناک اور غیض وغضب کا مظہر ہوتی تھی۔ مقاتلین (Belligerents) اور غیر مقاتلین (Non Belligerents) کا کوئی فرق نہیں تھا۔ لڑائی کا اثر سوسائٹی کے ہر طبقے پر پڑتا تھا۔ اور ہر شخص یکساں طور پر تہِ تیغ کیا جا سکتا تھا۔ بالخصُوص عورتیں ہوسناکیوں کا تختۂ مشق بنائی جاتی تھیں جنگی قیدیوں کو تکلیف دے کر مار ڈالنا، انہیں آگ میں ڈھکیل دینا، اُن کے اعضاء کو قطع و برید کرنا، لاشوں کے اعضاء کا کاٹ لیا جانا، اُن کی کھوپڑی کو بطورِ جامِ شراب استعمال کرنا، بغیر اعلان کے جنگ کرنا، اور عہد و پیمان کو توڑ دینا اُس زمانہ کی جنگوں میں معمولی باتیں تھیں ——— لیکن یہ تو صحرائے عرب کے وحشیوں کی باتیں ہوئیں۔ متمدن ممالک کا حال اُن سے بھی بدتر تھا۔

ہند

ہندوستان میں آریوں کی جنگیں غیر آریوں سے ہوئی تھیں جنہیں وُہ فطرتاً ذلیل اور نجس سمجھتے تھے۔ ویدوں کے منتروں سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ آریوں کے دل میں دُشمن کو ہولناک عذاب دینے کی خواہش موجود تھی۔ زندہ آدمی کی کھال کھینچنا، اس کی بوٹیاں کاٹ لینا، اُسے آگ میں جلانا، اُس کے اعضاء کا مثلہ کرنا، اُس کو درندوں سے پھڑوانا، جانوروں کی کھال میں اسے سی دینا، اور اُس کے اہل وعیال کو تہِ تیغ کر ڈالنا ——— یہ تعزیریں تھیں۔ جو وُہ اپنے دُشمن پر عاید

کرنا چاہتے تھے۔

روم و ایران

دنیا کے یہ مہذب ممالک اپنی بربریت میں ہر قوم سے آگے تھے۔ اُن کے ہاں عرب اور ہندوستان کے مذکورہ بالا مظالم کے علاوہ فصلوں اور باغوں کو تباہ کرنا اور بستیوں کو جلا کر راکھ کر ڈالنا فاتح کے لیے باعثِ فخر سمجھا جاتا تھا ——— سکندر اعظم نے شام کے قدیم تجارتی شہر صور کو چھ مہینے کے سخت محاصرہ کے بعد فتح کیا تو آٹھ ہزار بے گناہ انسانوں کو قتل کیا۔ اور تیس ہزار کو غلام بنا لیا ——— مفتوحین کے لیے اس زمانہ میں صرف دو ہی صورتیں تھیں۔ یا تو وہ قتل کیے جاتے تھے۔ یا غلام بنا لیے جاتے تھے!

سنہ ۷۰ء میں طیطس رومی نے بیت المقدس کو فتح کر کے شہر کی تمام حسین لڑکیوں کو فاتحین میں تقسیم کر دیا۔ ہر جوان مرد کو مصر کی کانوں میں مزدوری کے لیے یا روم کے ایمفی تھیٹروں میں قتل کر دیئے جانے یا وہاں کے کلوسیمس میں جنگی جانوروں سے پھڑوانے کے لیے بھیج دیا۔ اُس نے وہاں ستانوے ہزار آدمی گرفتار کیے۔ جن میں سے گیارہ ہزار بھوک کی تاب نہ لا کر مر گئے۔ اور ہلاک ہونے والوں کی تعداد ایک لاکھ تیس ہزار بتائی جاتی ہے ——!

نوشیروان نے سنہ ۵۴۰ء میں انطاکیہ کو لوٹ کر آگ لگا دی۔ اور سنہ ۵۷۶ء میں کیپیڈوسیا اور میلیٹائن کو جلا کر برباد کر دیا۔

خسرو پرویز نے سنہ ۶۴۵ء میں بیت المقدس کو فتح کر کے نوے ہزار انسانوں کو قتل کیا۔ اور عبادت گاہوں کو آگ لگا دی۔ اور اس کے جواب میں ہرقل نے جب ایران پر حملہ کیا۔ تو زرتشت کے وطن اُرمیان ہی کو پیوندِ خاک کر دیا ——— اور پھر جسٹینین نے جب افریقہ کے ونڈالوں پر حملہ کیا تو اُس نے پانچ لاکھ کی اس پوری قوم ہی کو ہمیشہ کے لیے صفحۂ ہستی سے مٹا کر ایک سرسبز و شاداب مُلک کو ویرانے میں تبدیل کر دیا۔

بحقیقت یہ ہے کہ رومی سلطنت غیر رومی سلطنتوں کے قانونی وجود ہی کو تسلیم نہیں کرتی تھی۔ یہی حال ایرانی سلطنت کا تھا جس کے نزدیک ہر غیر ایرانی وحشی اور باغی تھا

اور یہی سبب تھا۔ کہ یہ سلطنتیں جنگ میں ہر اخلاقی اور انسانی وجُوب کو نظر انداز کردیتی تھیں۔

اُمّی سپہ سالار

اس پس منظر میں دیکھیے کہ ایک جاہل قوم کا ایک اُمّی سپہ سالار جب اپنے بدترین دشمنوں کے شہر مکہ میں بحیثیت فاتح داخل ہوتا ہے۔ تو اس لیے نہیں کہ سکندر اعظم کی طرح تمام مفتوحین کو پا بہ زنجیر کرے۔ اس لیے نہیں کہ نوشیروان کی طرح شہر کو آگ لگا دے۔ اس لیے نہیں کہ چنگیز کی طرح دشمن کو صفحۂ ہستی ہی سے نابُود کر دے ـــــ بلکہ اس لیے اور صرف اس لیے کہ انسانی خُون کی حُرمت کو قائم کرے، باہمی اخوّت اور محبّت کو بحال کرے اور خدا اور اُس کے بندوں کا ٹُوٹا ہُوا رشتہ جوڑ دے ؎

تو برائے وصل کردن آمدی!
نے برائے فصل کردن آمدی

وہ ایک فاتح کی طرح شہر میں داخل ہو گیا ہے۔ اُس کے بدترین دُشمن اُس کے سامنے سرنگوں کھڑے ہیں۔ اُن میں اُس کے خُون کا پیاسا اَبوسفیان بھی ہے۔ اور ہندہ بھی ہے۔ جس نے اُس کے چچا حمزہؓ کا کلیجہ چبا دیا تھا۔ اور ساتھ ہی دس ہزار خون آشام تلواریں اُس کے ایک اشارے کی منتظر کھڑی ہیں ـــــ لیکن اُس کی زبان سے اگر کوئی بات نکلتی ہے۔ تو صرف یہ کہ:

لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ

یعنی آج کے دن تم پر کوئی الزام نہیں ہے، تم سے کوئی مواخذہ نہیں ہے کوئی باز پرس نہیں ہے، جاؤ تم سب آزاد ہو ـــــ! محمدؐ عربی کے دردمند دل سے رحمت کی گھٹائیں اُٹھتی ہیں اور فضائی پریشانی کو رفع کر کے انسانی قصُور کی پردہ داری کرتی ہیں۔ اور اسی کا عفوِ تام دہشت کو دُور کرتا ہے۔ حیاتِ نو کا پیغام دیتا ہے۔ اور انسانی قلُوب کو انسانی خوف سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آزاد کر دیتا ہے!

اصلاحات

آنحضرت صلعم نے جنگ کے متذکرہ بالا تمام وحشیانہ طریقوں

کو منسوخ کر دیا۔ اور ایسے قوانین نافذ فرمائے کہ اس ترقی یافتہ دور میں بھی مجلس اقوام متحدہ کا کوئی دستور ان سے بہتر ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ آپ کا اصول یہ ہے کہ جنگ میں صرف اتنی ہی قوت استعمال کی جانی چاہیے جو فتنہ کے انسداد کے لیے انتہائی ضروری ہو۔ اور اس قوت کے استعمال کی زد میں صرف انہی لوگوں کو آنا چاہیے جو عملاً برسر پیکار ہوں۔ یا جن سے شر کا اندیشہ ہو۔ آپ نے اسلامی جنگوں کو "جہاد فی سبیل اللہ" کا نام دے کر مقصدِ جنگ کی تطہیر کی۔ اور اس پاکیزہ تصور کے تحت جنگ کا ایک مکمل ضابطۂ قانون وضع فرمایا۔ جس کے چند نمایاں پہلو درج ذیل ہیں :۔

۱۔ وحشیانہ افعال کی ممانعت ——— جب کبھی آپ کوئی مہم بھیجتے تو فوج کو نصیحت کرتے کہ :۔

"جاؤ اللہ کا نام لے کر اور اللہ کی راہ میں لڑو اُن لوگوں سے جو اللہ سے کفر کرتے ہیں۔ مگر جنگ میں کسی سے بدعہدی نہ کرو۔ غنیمت میں خیانت نہ کرو۔ مثلہ نہ کرو اور کسی بچے کو قتل نہ کرو، نہ بوڑھے اور نہ کسی عورت کو"

آپ نے ان تمام وحشیانہ افعال کی ممانعت کر دی جو عہدِ جاہلیت کی لڑائیوں میں روا رکھے جاتے تھے۔ مثلاً

(ل) دشمن کو آگ میں جلانا : آپ نے فرمایا کہ :۔

"آگ کا عذاب دینا سوائے آگ کے پیدا کرنے والے کے کسی کو جائز نہیں ہے"۔

(ب) دشمن کو باندھ کر قتل کرنا : جسے اس زمانہ کی اصطلاح میں "صبر" کہتے ہیں

(ج) فصلوں اور باغوں کو تباہ کرنا : جنگی ضروریات کے لیے البتہ درختوں کے کاٹنے کی اجازت ہے۔

(د) قتل عام اور آتش زنی

(ھ) مثلہ کرنا : یعنی دشمن کی نعشوں کو بے حرمت کرنا اور ان کے اعضاء کا قطع و برید کرنا۔

(و) قیدیوں کو قتل کرنا: آپؐ نے اسیران جنگ کو قتل کرنے کی سخت ممانعت کی۔ اور حکم دیا کہ اُن کے ساتھ نیک سلوک کیا جائے۔ جنگِ بدر کے قیدیوں کو آپؐ نے اپنے سپاہیوں کے ساتھ کھانا کھلایا۔ ان میں سے اکثر کو اس عہد پر رہا کر دیا کہ وُہ آئندہ جنگ میں حصّہ نہیں لیں گے۔ اور باقی کو مسلمان بچوں کا اتالیق مقرر کیا۔ اسی طرح حنین کے چھ ہزار قیدیوں کو آپؐ نے نہ صرف چھوڑ دیا۔ بلکہ انہیں کپڑے کے چھ ہزار جوڑے بھی دیئے ——— اسیرانِ جنگ کے متعلق اسلام کا قانون یہ ہے کہ اختتام جنگ پر یا تو بغیر فدیہ کے انہیں رہا کیا جائے۔ یا فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے۔ اور اگر یہ صورت بھی نہ ہو تو قید میں رکھ کر اُن کے ساتھ نیک سلوک کیا جائے۔

۲۔ **غیر محاربین کی حفاظت** ——— آپؐ نے دُشمن کی آبادی کو دو حصّوں میں تقسیم کیا۔ محاربین (combatants) اور غیر محاربین (Non combatants) محاربین وُہ ہیں۔ جو عملاً جنگ میں حصّہ لیتے ہیں۔ اور غیر محاربین وُہ ہیں۔ جو عقلاً و عملاً جنگ میں حصّہ لینے کی قدرت نہیں رکھتے۔ مثلاً عورتیں، بچے، بُوڑھے، زخمی، سیاح خانقاہ نشین وغیرہ۔ آپؐ کے احکام کے مطابق محاربین کو قتل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن غیر محاربین پر وار کرنا قطعاً ممنوع ہے۔ کئی حدیثوں میں اس کی تاکید فرمائی گئی ہے۔ نیز محاربین پر حملہ کے حق پر بھی کئی تحدیدیں عاید کی گئی ہیں۔ مثلاً

(و) "واضربوا منھم کل بنان": یعنی اُن کی جوڑوں پر مارو۔ ظاہر ہے۔ کہ دُشمن کو لڑائی کے ناقابل کر دینے اور ساتھ ہی خونریزی کو حتی الامکان گھٹانے کی اس سے بہتر ہدایت، کسی دست بدست لڑائی کے لیے نہیں دی جا سکتی

(ب) غفلت میں کسی پر حملہ نہ کیا جائے: آنحضرت صلعم کسی دُشمن قوم تک رات کے وقت بھی اگر پہنچتے تو صبح ہونے سے پہلے اُس پر حملہ نہیں کرتے تھے۔

(ج) سفیروں کو قتل نہ کیا جائے: آپؐ سے پہلے اس کا رواج تھا۔

(د) مُعاہدوں کی خلاف ورزی نہ کی جائے: احادیث میں ایسی خلاف ورزی کو

بدترین گناہ قرار دیا گیا ہے۔ اور قرآن مجید میں متعدد مقامات پر ایفائے عہد کی تاکید کی گئی ہے۔ فرمایا گیا ہے کہ :-

"وَاَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا

یعنی عہد پورا کرو۔ کیونکہ عہد کے بارے میں باز پرس ہوگی"۔

(ھ) راہروؤں کو نہ ستایا جائے : جنگ کے لیے لشکر جا رہا ہو تو اُس کے لیے جائز نہیں ہے کہ راستہ میں کسی راہرو یا کسی غیر شخص کو پریشان کرے۔ یا اُس کا مال و اسباب لوٹ لے۔

۳۔ اعلانِ جنگ ——— اگر کوئی قوم مسلمانوں سے معاہدہ کر لے لیکن شرائط کی خلاف ورزی کرے تو اس کے ساتھ جنگ کرنے سے پہلے اُسے الٹی میٹم اور مُہلت دینا ضروری ہے۔ قرآن مجید کا حکم ہے کہ :-

"اگر تمہیں کسی قوم سے خیانت و بدعہدی کا خوف ہو تو اُن کے معاہدہ برابری کو ملحوظ رکھ کر اُن کی طرف پھینک دو"۔ (انفال-۷)

یعنی اس کو صاف طور پر آگاہ کیا جائے کہ اب معاہدہ باقی نہیں ہے

۴۔ غیر جانبداری ——— تمام غیر مسلم قومیں دو حصّوں میں تقسیم کی جاتی ہیں۔ ایک تو وُہ جن سے ہمارا معاہدہ ہے۔ اور دُوسرے وُہ جن سے کوئی معاہدہ نہیں ہے۔ معاہدین جب تک معاہدہ کی شرائط کی پابندی کرتے رہیں گے۔ اُن سے کوئی جھگڑا نہیں ہو سکے گا۔ اس حالت کو اسلامی قانونِ جنگ میں غیر جانبداری کہا جا سکتا ہے۔ ورنہ غیر جانبداری کی کوئی خاص اصطلاح ہمارے ہاں موجود نہیں ہے۔ غیر معاہدین کے ساتھ ہمارے تعلقات اس طرح قائم رہیں گے کہ گویا حالتِ جنگ موجود ہے جن قوموں سے معاہدہ ہو چکا ہو ان سے جب تک کہ معاہدہ نافذ ہو کوئی تعرض نہیں کیا جا سکتا نہ اُن کے ملک میں مظلوم مسلمانوں کی حمایت کی جا سکتی ہے (انفال-۱) اور نہ اُن کی حدود میں دُشمن کا تعاقب کیا جا سکتا ہے۔ (النساء-۱۲)

۵۔ غلامی ——— ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ اسلام اگر حریت انسانی کا

علمبردار ہے تو اس میں اسیرانِ جنگ کی غلامی کا کیا جواز ہے؟ ——— درحقیقت اس مسئلہ کو اس کے پس منظر میں دیکھنا چاہیے۔ تاکہ اس کے خدوخال نمایاں ہو سکیں۔ اور کسی غلط فہمی کا کوئی امکان باقی نہ رہے ———!

بعثتِ رسولؐ سے قبل ساری دنیا میں اسیرانِ جنگ کے ساتھ انتہائی بہیمانہ سلوک روا رکھا جاتا تھا۔ ہندوستان میں "شودروں" کی ذات ہی علیحدہ کر دی گئی تھی۔ اور انہیں ہر انسانی حق سے محروم کر دیا گیا تھا۔ رومیوں اور یونانیوں کے ہاں اسیرانِ جنگ یا تو قتل کیے جاتے تھے۔ یا غلام بنا لیے جاتے تھے۔ نیز غیر قوموں کو محض غلام بنانے کے لیے جنگ کرنا بھی یونانیوں کے ہاں جائز تھا ——— روم کی تماشہ گاہوں میں اسیرانِ جنگ ہی کو زندہ جلایا جاتا تھا۔ انہیں عقوبتیں دے کر قتل کیا جاتا تھا۔ یا درندوں سے انہیں پھڑوا دیا جاتا تھا۔ اور بسا اوقات یہ تماشے ایسے بڑے پیمانے پر ہوتے تھے۔ کہ ہزاروں غلاموں کو ایک ہی رات تہِ تیغ کر دیا جاتا تھا۔

نیز رومی معاشرہ میں ان کا کوئی مقام نہیں تھا۔ ان کے خون کی کوئی قیمت نہیں تھی۔ جیسا کہ فیریرؔ نے لکھا ہے کہ "وہ ذلت کے بچپن، مشقت کی جوانی اور بے رحمانہ تغافل کے بڑھاپے میں پیدائش سے موت تک کے مراحل طے کرتے تھے"۔

ایران کے غلام بھی ان مصائب سے محفوظ نہیں تھے۔ وہاں بھی ان کے ساتھ جانوروں سے بدتر سلوک کیا جاتا تھا۔ انہیں سخت سے سخت جسمانی مضرت پہنچانے پر بھی کوئی باز پرس نہیں ہوتی تھی۔ اور نہ ملکی رواج اور قومی اخلاق میں ان کی بہتری کے لیے کوئی گنجائش تھی۔

ان حالات میں غلامی کے مسئلہ کا حل آنحضرت صلعم کو دریافت کرنا تھا۔ آپ کے سامنے کئی دشواریاں تھیں۔ اور کئی مشکلات آپ کی راہ میں حائل تھیں۔ غلامی کے ادارہ کو یک لخت برخاست کرنا نہایت درجہ پیچیدگیوں اور الجھنوں کا باعث ہو سکتا تھا۔ اس لیے آپ نے اس معاملہ میں بالراست اصلاح کی بجائے بالواسطہ ایسی تدبیریں اختیار کیں۔ کہ تمام مضرتیں اور خرابیاں دور ہو گئیں۔ اور غلامی کا نام اگرچہ

باقی رہ گیا۔ لیکن یہ غلامی اجتماعی مضرت کی جگہ انسانی منفعت میں تبدیل ہو گئی۔ اور مجبوروں اور لاچاروں کی بے بسی اور بے کسی کا ایک بہترین حل بن گئی ——!

بسا اوقات بڑی لڑائیوں میں مفتوح فریق کے مردوں کا بڑا حصہ ہلاک ہو جاتا تھا اور ان کے پسماندہ عورتوں اور بچوں کی خبر گیری و پرورش کا مسئلہ نازک صورت اختیار کرتا تھا۔ بلکہ عورتوں کے بے سہارا ہو جانے سے مفاسد کا دروازہ بھی کھل جاتا تھا۔ اس کا ایک ہی علاج تھا۔ کہ فاتح ان کی پرورش کی ذمہ داری بھی قبول کریں۔ اور عورتوں سے ازدواجی تعلقات بھی قائم کر سکیں۔ تاکہ سوسائٹی میں ان کا ایک مقام پیدا ہو سکے اور ہر فتنہ و فساد کا سدباب بھی ہو سکے۔

اس زمانہ میں اسیرانِ جنگ کے تبادلے کا رواج نہیں تھا۔ مسلمان سپاہی اگر قید ہوتے تو دشمن انہیں غلام بنا کر رکھ لیتا۔ ان حالات میں مسلمانوں کے لیے بھی بجز اس کے کوئی اور چارہ نہیں تھا۔ کہ وہ بھی دشمن کے سپاہیوں کو جو گرفتار ہو کر آئیں غلام بنا کر رکھ لیں۔ لیکن آنحضرت صلعم نے ان غلاموں کو سوسائٹی میں ایک ایسا مقام عطا کیا جو انسان کے شایانِ شان ہو سکتا تھا۔ اور ساتھ ہی غلامی کی مضرتوں کو رفع کرنے کے لیے آپ نے حسب ذیل تدبیریں بھی اختیار فرمائیں :-

۱۔ تبادلہ —— جب بھی اسیرانِ جنگ کے تبادلہ کا کوئی موقع ملا آپ نے اسے بخوشی منظور کر لیا۔ آپ ہی کے طرزِ عمل کی بناء پر فقہائے اسلام نے یہ اصول مدون کیا۔ کہ دشمن اگر راضی ہو تو اسیرانِ جنگ کا تبادلہ کر لینا چاہیے۔

۲۔ اختیارِ تمیزی —— آپ نے اسیرانِ جنگ کو غلام بنانے کا حکم نہیں دیا بلکہ صرف اجازت دی ہے۔ اور اس اختیارِ تمیزی سے فائدہ نہ اٹھانے کو افضل قرار دیا ہے۔

۳۔ حدود —— آپ نے اسیرانِ جنگ کی حدود بھی قائم فرما دی ہیں۔ چنانچہ صرف محاربین ہی کو گرفتار کیا جا سکتا ہے۔ غیر محاربین یا مصافی آبادی میں سے کسی کو پکڑ لینے کی سخت ممانعت فرمائی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ :-

"تین شخص ہیں۔ جن کے خلاف قیامت میں مَیں خُود مُدعی ہوں گا۔ ایک وُہ جس نے میرا ذمہ دے کر بدعہدی کی۔ دُوسرے وُہ جس نے آزاد انسان کو بیچا۔ اور اُس کی قیمت کھائی۔ اور تیسرا وُہ جس نے کسی مزدُور سے پُورا پُورا کام لیا۔ اور اُس کی مزدوری نہ دی"۔ (بخاری)

۴۔ غلام کو آزاد کرنا ــــ غلام کو آزاد کرنے کا بڑا اجر بتایا گیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ غُلام کو آزاد کرنا دوزخ سے بچنے کا ایک طریقہ ہے۔ اور جو شخص جتنا زیادہ قیمتی اور پسندیدہ غلام آزاد کرے گا وُہ اتنا ہی زیادہ ثواب کا مستحق ہوگا۔ آپؐ نے یہ بھی فرمایا ہے۔ کہ جس نے اپنی لونڈی کو تربیت دے کر آزاد کیا اور اُس سے نکاح کر لیا۔ اُسے دوہرا ثواب ملے گا ــــ آپؐ نے ہر ہر قدم پر غُلاموں کی آزادی پر زور دیا۔ اور دفع بلیات اور کفارۂ گناہ کے لیئے بھی اُسے مستحسن قرار دیا ہے۔

قرآن مجید میں بھی غلام کی آزادی کو نیکی کا دشوار گزار راستہ بنایا گیا ہے۔ (البلد ــ ۱)

۵۔ حُسنِ سلوک ــــ آپ نے غلاموں کے ساتھ حُسنِ سلوک کی بار بار تاکید فرمائی ہے حتیٰ کہ اپنی زندگی کے آخری لمحات میں بھی نماز کی تاکید کے ساتھ ساتھ غلاموں سے نیک برتاؤ کا حُکم دیا ہے۔

آپؐ نے فرمایا کہ غلاموں کو "میرا لڑکا" اور "میری لڑکی" کہہ کر پکارو۔ اُنہیں اپنے ساتھ ایک ہی دسترخوان پر کھانا کھلاؤ۔ اور اگر وُہ دن میں ستر بار بھی قصُور کریں تو اُنہیں معاف کردو۔

۶۔ فوجداری اور دیوانی حقوق ــــ اسلامی فوجداری قانون غلاموں اور آزادوں کی یکساں حفاظت کرتا ہے۔ اور دیوانی قانون اُن کی املاک پر اُن کی ملکیت اور تصرّف کے حق کو تسلیم کرتا ہے۔

۷۔ مساوات ــــ آنحضرت صلعم کی تعلیمات کی بدولت اسلامی سوسائٹی

میں غلاموں کو عملاً مساوات کا درجہ مل گیا ہے۔ اور زندگی کے ہر شعبہ میں وہ بلا روک ٹوک ترقی کر سکتے ہیں ــــــ آپ کی پھوپھی زاد بہن حضرت زینبؓ ایک آزاد کردہ غلام زیدؓ بن حارثہ سے بیاہی گئی تھیں۔ امام حسن بصریؒ ایک غلام کے بیٹے تھے۔ سلمانؓ فارسی بھی غلام ہی تھے جنہیں اہلِ بیت میں شمار کیا جاتا تھا۔ بلالؓ حبشی بھی غلام تھے جنہیں حضرت عمرؓ "آقا" کہتے تھے۔ اور رسولؐ کے پیارے نواسے حضرت امام حسینؓ کی شریکِ حیات اور دنیا کے تمام سادات کی جدۂ اعلیٰ بھی جنگ ہی میں اسیر ہو کر آئی تھیں ـــ اس تاریک دور میں جبکہ اسیرانِ جنگ وحشت اور بہیمیت کا تختۂ مشق بنائے جاتے تھے۔ آپ نے اُن کے ساتھ نیک سلوک کی ہدایت کی۔ اُن کے انسانی حقوق کی حفاظت کی۔ اُن کے معیارِ زندگی کو بلند کیا۔ اور اُن کے معاشری درجہ کو ایسی رفعت عطا کی کہ

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمودؔ و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

۶۔ **لوٹ کا مال** ــــــ عربوں کے نزدیک مالِ غنیمت سب سے زیادہ حلال و طیب ذریعۂ معاش ہونے کے باعث سب سے زیادہ مرغوب تھا اسی لیے رسولِ عربی نے اس کے متعلق تدریجی طریقہ اختیار کیا۔ جب کبھی کوئی چیز قدیم رواج کی حیثیت اختیار کر کے عادت میں داخل ہو جاتی ہے تو اس کا ازالہ بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ اور اس کے اثرات مدتوں کام کرتے رہتے ہیں ــــــ مالِ غنیمت کے اسی موروثی شوق کے ساتھ اہلِ عرب اسلام میں داخل ہوئے تھے۔ اور ہر موقع پر بلا ارادہ لوٹ کھسوٹ کی طرف مائل ہو جاتے تھے۔ چنانچہ جنگِ اُحد میں غنیمت کے لالچ ہی کے سبب سے جیتی ہوئی بازی ہار دی گئی تھی۔

سب سے پہلے جنگِ بدر میں قبل اس کے کہ مالِ غنیمت یکجا کیا جاتا مجاہدینِ اسلام لشکرِ قریش کو لوٹنے میں جبلّی طور پر مصروف ہو گئے۔ لیکن چونکہ غنیمت جہادِ اسلامی کی حقیقت میں داخل نہیں ہے۔ اس لیے تبارک تعالیٰ نے تنبیہ فرمائی کہ:۔

"اگر خدا کی طرف سے پہلے سے حکم نہ ہو چکا ہوتا۔ تو جو کچھ تم نے لیا ہے

اس پر عذاب نازل ہوتا" (انفال - ۹)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے سب سے پہلے معرکہ جہاد میں غنیمت ناجائز تھی۔ لیکن انسانی فطرت کے ناقابلِ تغیر رجحانات کے مدِنظر اسے حلال کر دیا گیا۔ اور پھر رفتہ رفتہ اس رجحان سے تخریبی عناصر کو خارج کرنے کی کامیاب سعی کی گئی قرآن نے فرمایا کہ :-

"لوگ تجھ سے غنیمت کے متعلق پوچھتے ہیں۔ کہدے کہ غنیمت خدا اور رسولؐ کی ہے"

اس آیت نے اس بات کو صاف کر دیا ہے۔ کہ مالِ غنیمت کے لیئے مجاہدین دعویٰ نہیں کر سکتے۔ بلکہ اس کی تقسیم رسولؐ اللہ کے اختیار میں ہے۔ اس حکم کا بڑا مفید نتیجہ برآمد ہوا۔ اب ہر شخص اپنی مرضی کے مطابق کسی چیز کو لوٹ کر اپنے لیئے حاصل نہیں کر سکتا تھا۔

آنحضرت صلعم نے مالِ غنیمت کی حدود اور شرائط مقرر فرمائیں۔ آپ نے حصولِ غنائم کے شوق کو زائل کرنے کے لیئے جدوجہد کی۔ اور فرمایا کہ جو شخص غنیمت حاصل کرنے کی نیت سے جنگ کرے گا۔ اُس کو جہاد کا ثواب نہیں ملے گا۔

"جس فوج نے اللہ کی راہ میں جنگ کی اور مالِ غنیمت پا لیا، اس نے اپنی آخرت کے ثواب میں سے دو تہائی حصہ یہیں پا لیا۔ اور اُس کے لیئے صرف ایک تہائی ثواب باقی رہ گیا۔ اور جس نے غنیمت نہ پائی اُسے پورا اجر ملے گا" (مسلم)

آنحضرت صلعم کی یہ کوشش بارآور ہوئی۔ اور تھوڑے ہی عرصہ میں مجاہدینِ اسلام مالِ غنیمت کی بجائے رضائے رسولؐ اور ثوابِ آخرت کے لیئے میدانِ جنگ کا رُخ کرنے لگے۔ ایسے متعدد واقعات تاریخ میں محفوظ ہیں۔ جبکہ مسلمان سپاہیوں نے مالِ غنیمت کے لینے سے انکار کر دیا۔ اور باوازِ بلند یہ اعلان کیا کہ :-

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن
نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی!

قرآنِ مجید کے ایک حکم کے تحت مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ محتاجوں، معذوروں اور مسکینوں کی پرورش اور عام قومی ضروریات کے لیے علیحدہ کیا جانے لگا۔ حکم یہ تھا:۔

"جان لو کہ جو کچھ مالِ غنیمت تم کو حاصل ہو۔ اُس کا پانچواں حصہ اللہ اور اُس کے رسولؐ اور اہلِ قرابت اور یتامیٰ اور مساکین اور مسافروں کا حصہ ہے"۔ (انفال)

آپؐ نے اصطلاح "مالِ غنیمت" کو بھی محدود کر دیا۔ اور اس کا اطلاق صرف ایسے مال پر کیا۔ جو میدانِ جنگ میں دشمن کی افواج سے فاتح فوج کے ہاتھ آئے۔ اس اصول کی بدولت پُر امن غیر فوجی آبادیاں سپاہیوں کی لوٹ کھسوٹ سے محفوظ ہو گئیں۔ حالانکہ اسلام سے پہلے متحارب جماعتوں کے نزدیک ایسے امتیاز کا کوئی تصور بھی موجود نہیں تھا ——— جو مال کہ صلح یا امان کے ذریعے مسلمانوں کے ہاتھ آئے یا جس پر لڑائی کے بعد اسلامی افواج کا قبضہ ہو اُسے حکومتِ اسلامیہ کی مِلک قرار دیا گیا ہے۔

ان شرائط اور حدود کے مدِّ نظر اصطلاح "غنیمت" پر غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ یہ اصطلاح عہدِ حاضر کے "غنائمِ جنگ" کے مترادف ہو جاتی ہے، جسے قانونِ بین الممالک فاتح کا حق سمجھتا ہے ——— لیکن دونوں میں ایک اہم فرق ہے موجودہ مغربی قانون کے تحت تمام مال حکومت کو حاصل ہوتا ہے۔ لیکن اسلام نے ٹھوس حقائق کے مدِّ نظر ایسے مال کے ۴/۵ حصہ پر اُن سپاہیوں کا حق تسلیم کیا ہے جو اللہ اور اُس کے رسولؐ کی رضا اور خوشنودی کی خاطر معرکۂ کارزار میں سر بکف کود پڑتے ہیں ———!

۷۔ **صلح و امان** ——— اسلام نے جنگ کی غایت یہ بیان کی ہے کہ فتنہ کو مٹا

دیا جائے۔ تاکہ لڑائی کی ضرورت باقی نہ رہے —— اس لحاظ سے دشمن اگر صُلح کی درخواست کرے تو اسے قبول کرنا ہم پر واجب ہے۔ چنانچہ قرآن شریف فرماتا ہے کہ :-

" اگر وہ صُلح کے لیے جھکیں تو تم بھی جُھک جاؤ۔ اور اللہ پر بھروسہ رکھو کہ وُہ سب کچھ سُنتا اور جانتا ہے"۔ (انفال)

اور

" اگر وُہ تُم سے ہاتھ کھینچ لیں اور جنگ نہ کریں اور صُلح کی خواہش کریں تو ایسی حالت میں اللہ نے تُم کو اُن پر دست درازی کی کوئی راہ نہیں دی ہے"۔ (النساء)

نتائج رسُولِ عربی کی ان اصلاحات نے آٹھ سال کی قلیل مدت میں عرب کی تاریخِ جنگ کا ڈھانچہ بدل دیا۔ اور درندگی کا انسداد کر کے اہلِ عرب کے ذہن و فکر کو انسانیت اور صداقت کے سانچے میں ڈھال دیا —— پھر خونخواروں نے انسانی خُون کی حُرمت کی مثال قائم کی۔ وحشت کے حامیوں نے امن اور آشتی کا پیام دیا، بربریت کے مجسموں نے عدل و انصاف کا درس دیا۔ اور غارتگروں اور راستہ لُوٹنے والوں نے نوعِ انسانی کے حقوق کے تحفظ کا اعلان کیا —— اور جب وُہ مکّے میں فاتح کی حیثیت سے داخل ہُوئے۔ جہاں سے انہیں تکلیفیں دے کر نکالا گیا تھا۔ جہاں اُن کی جائدادوں کو لُوٹ لیا گیا تھا۔ جہاں اُن کے عزیزوں کو عقوبتیں دے کر قتل کیا گیا تھا۔ اور جہاں سے خونخوار لشکرِ قریش اسلام کو مٹانے اور اس کے نام لینے والوں کو تہ تیغ کرنے کے ارادے سے بار بار مدینے کی طرف بڑھ آیا تھا۔ تو اُن کی پیشانیوں پر غصّہ کی شکن نہیں تھی۔ اُن کی آنکھوں سے قہر نہیں ٹپک رہا تھا۔ ان کے دل میں انتقام کا شعلہ نہیں بھڑک رہا تھا —— ! وُہ مکّے میں حریتِ انسانی کا پیام لے کر داخل ہُوئے تھے، انسانی رفعت کا علم تھامے ہُوئے تھے۔ محبّت کی عطر بیز ہوائیں بیت اللہ کے طواف کے لیے اُن کے ساتھ آگے بڑھ رہی تھیں —— اور یہ

سب کچھ آج سے تیرہ سو برس پہلے ایک ایسے "تاریک دور" میں ہو رہا تھا جبکہ دُنیا کی تہذیب کا علم خسرو پرویز اور ہرقل جیسے خونخوار اور جہاں سوز بادشاہوں کے ہاتھ میں تھا۔ جبکہ شہروں کو جلا کر راکھ کا ڈھیر کیا جا رہا تھا، نوعِ انسانی پر ڈکیتوں کے حملوں کا سلسلہ جاری تھا۔ اور مجبور و مقہور انسانیت کو خون کی ندیوں میں نہلایا جا رہا تھا۔

مغربی قوانینِ جنگ

آیئے اس پس منظر میں مغربی قوانین جنگ پر ایک سرسری نظر ڈالیں۔ اور یہ معلوم کریں کہ ان قوانین نے کہاں تک انسان کی خدمت کی ہے؟

سترہویں صدی کی ابتدا تک یورپ میں قوانینِ جنگ کا کوئی تصور موجود نہیں تھا۔ محاربین کو ایک دوسرے کی مضرت رسانی کا غیر محدود اور غیر مشروط حق حاصل تھا۔ مشہور مقنن "گروٹیس" کے قول کے مطابق "قانون میں ان تمام لوگوں کو قتل کر دینا جائز ہے جو دُشمن کی حدود میں پائے جائیں۔ ان میں عورتوں اور بچوں کا کوئی استثناء نہیں ہے۔ اور نہ وہ اجنبی باشندے مستثنیٰ ہیں جو ایک معقول مُدت کے اندر دُشمن کے علاقہ کو نہ چھوڑ دیں"۔

پہلی مرتبہ جنگ سی سالہ کے خاتمہ پر ۱۶۴۸ء میں صلح نامہ ویسٹ فالیہ کی ترتیب کے وقت "گروٹیس" کی اس تجویز کا لحاظ رکھا گیا کہ "جنگ میں بطور ایک شریفانہ رعایت کے بچوں، بوڑھوں، عورتوں، پادریوں، کاشتکاروں، تاجروں اور اسیرانِ جنگ کو قتل و غارت سے محفوظ رکھنا چاہیے" —— لیکن یورپی قانونِ بین الممالک میں جنگ کے متعلق کوئی واضح اصول ۱۸۹۹ء کی ہیگ کانفرنس سے پہلے نظر نہیں آتا۔ اس کانفرنس میں جنگ کے مختلف شعبوں کے متعلق کچھ سمجھوتے اور اقرار نامے مرتب کیے گئے تھے۔ لیکن کام کی تکمیل نہیں ہو سکی تھی۔ اس لیے ۱۹۰۷ء میں اس کا دوبارہ اجلاس ہُوا۔ اور پہلی مرتبہ ایک مکمل قانونِ جنگ مرتب کیا گیا جس کا نچوڑ یہ ہے:۔

۱۔ اعلانِ جنگ ——— ۱۷۰۰ء سے ۱۸۷۲ء تک یورپ میں ایک سو بیس لڑائیاں ہوئیں۔ جن میں سے صرف دس لڑائیوں میں رسمی اعلانِ جنگ کیا گیا تھا پہلی مرتبہ اس ہیگ کنونشن کے فقرۂ اوّل میں یہ پابندی عاید کی گئی۔ کہ بغیر اعلان کے جنگ نہ کی جائے۔ اور فقرۂ دوم میں غیر جانبدار ممالک کو آگاہ کر دینے کا لزوم بھی رکھا گیا ہے ——— پہلی جنگِ عظیم میں ہر محارب فریق نے کسی نہ کسی صورت میں اعلانِ جنگ کیا تھا۔ اور لڑائی شروع کرنے کے لیے وقت اور تاریخ کا بھی تعین کر دیا تھا۔ لیکن دوسری جنگِ عظیم میں جرمنی نے بغیر کسی اعلانِ جنگ کے پہلی ستمبر ۱۹۳۹ء کو پولینڈ پر حملہ کر دیا۔ اور اس کے بعد اسی طرح ڈنمارک، ناروے، لکسمبرگ، بلجیم، ہالینڈ یوگوسلاویہ اور رُوس پر چڑھائی کر دی۔ اس کے برعکس برطانیہ اور فرانس نے ہیگ کنونشن کے احکام کی پوری طرح تعمیل کی۔ برطانیہ نے ۳ ستمبر کو گیارہ بجے صبح اور فرانس نے پانچ بجے شام کا وقت لڑائی کے آغاز کے لیے مقرر کیا۔ اسی طرح ۱۹۴۰ء میں اٹلی نے جب برطانیہ اور فرانس سے جنگ کرنی چاہی تو اُس نے ۱۱ جون کو بارہ بجے کا وقت مقرر کیا۔

۲۔ اہلِ قتال اور غیر اہلِ قتال ——— غیر محارب (Non Belligerent) اور مقاتل (Combatant) میں فرق کیا گیا۔ مقاتل کے نظر آتے ہی گولی مار دی جا سکتی ہے اور اگر وُہ زندہ گرفتار ہو جائے تو بحیثیت جنگی قیدی کے رکھے جانے کا مستحق ہے اس تعریف میں بری، بحری اور ہوائی افواج کے سپاہی، تجارتی بیڑوں کے عہدیدار اور ملاح بھی شامل ہیں۔ اس میں غیر مفتوح ممالک کے ایسے باشندے بھی شامل ہیں جو کہ حملہ آوروں کے خلاف ہتھیار لے کر کھڑے ہو جائیں۔ بشرطیکہ وُہ کھُلم کھلا ہتھیار رکھتے ہوں۔ قوانینِ جنگ کی پابندی اور یونیفارم استعمال کرتے ہوں اور کسی سالار کی کمان میں لڑ رہے ہوں۔[۱]

---

[۱] : ستمبر ۱۹۴۸ء میں انڈیا یونین نے سلطنت حیدر آباد دکن پر جب حملہ کیا۔ تو وہاں کے باشندوں کی رضاکار جماعتوں نے مدافعت شروع کی۔ یہ رضاکار تمام قوانینِ جنگ کی پابندی کرتے تھے۔ لیکن ان کی گرفتاری پر ہندوستانی افسر انہیں گولی مار دیتے تھے۔

غیر محارب وہ ہیں جو لڑائی میں حصّہ نہ لیتے ہوں۔ اور کسی فوج سے کوئی تعلق نہ رکھتے ہوں۔ دُشمن کے غیر فوجی افراد کو جو ملک میں موجود ہوں۔ یا تو نظر بند کیا جاتا ہے یا ملک سے خارج کیا جاتا ہے۔ اور بعض صُورتوں میں جبکہ ان سے کوئی خطرہ نہ ہو۔ آزاد بھی چھوڑ دیا جاتا ہے۔ مقبوضہ یا ایسے علاقہ میں جہاں کہ لڑائی جاری ہو۔ غیر محارب کو اُس وقت تک کوئی مضرت نہیں پہنچائی جاسکتی۔ جب تک کہ اس کی سخت ضرورت نہ ہو گوریلوں اور ایسے تجارتی جہازوں کے عہدیداروں کو جو دوسرے جہازوں پر حملے کرتے ہوں۔ مراعات حاصل نہیں ہو سکتیں۔ جاسوس بھی ان حقوق سے محروم ہیں۔ انہیں سزائے موت دی جاتی ہے۔

۲۔ جنگ ـــــ قواعدِ جنگ کی تدوین کی گئی اور جنگ کی وحشت کو گھٹانے کی سعی کی گئی۔ جان و مال کی غیر ضروری تباہی، زہریلی اور پھٹنے والی گولیوں کے استعمال، قتلِ عام اور غیر محفوظ شہروں کی بمباری کی ممانعت کی گئی۔ اور اس امر پر زور دیا گیا کہ دشمن کی درخواست پر اسے امن دیا جانا چاہیئے۔ اس بات کی بھی ہدایت کی گئی کہ بیمار اور زخمیوں کا معقول انتظام کیا جائے۔ جنگی قیدیوں کے ساتھ اچھا سلوک روا رکھا جائے۔ اور غیر فوجی آبادیوں پر حملہ سے حتی الامکان گریز کیا جائے۔ ہسپتالوں، کلیساؤں، تعلیم گاہوں، مدرسوں اور نمائش گاہوں وغیرہ کو جو کہ جنگی مقاصد کے لیئے استعمال نہ کیئے جا رہے ہوں۔ کوئی نقصان نہ پہنچایا جائے۔

۳۔ جائداد ـــــ دُشمن حکومت کی غیر منقولہ جائداد کو دورانِ جنگ میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اسے ضبط نہیں کیا جا سکتا۔ ایسی منقولہ جائداد جس کا تعلق فنونِ لطیفہ سائینس اور علوم سے نہ ہو ضبط کی جاسکتی ہے۔ دُشمن مُلک کے باشندوں کی خانگی جائداد پہلے ضبط کی جاسکتی تھی۔ لیکن ہیگ کانفرنس میں اس اصُول کی ترمیم کی گئی۔ ایسی جائداد اگر اپنے مُلک میں موجود ہو۔ تو حکومتِ مقامی اس پر نگرانی قائم کر سکتی ہے۔ تاکہ اُس کا استعمال دُشمن کے مقاصد کے لیئے نہ ہو سکے۔ مقبوضہ علاقہ میں یہ جائداد بغیر معاوضہ ادا کرنے کے حاصل نہیں کی جا سکتی۔ لیکن اگر جنگ کی اغراض کے لیئے...

ضرورت ہو۔ تو اس جائداد کو بغیر معاوضہ کے تباہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ بدامنی کی صورت میں مقبوضہ علاقہ کے باشندوں پر جرمانہ اور اقتصادی ضروریات کے لیے ٹیکس بھی عاید کیا جا سکتا ہے ـــــ دشمن حکومت کی بحری جائداد عام طور پر ضبط کی جا سکتی ہے۔ لیکن خانگی جائداد کی ضبطی مشروط ہوتی ہے۔

۴۔ غیر جانبداری ـــــ انیسویں صدی عیسوی تک مغرب غیر جانبداری کے اصول سے زیادہ آشنا نہیں تھا۔ درحقیقت یہ تصور بہت آہستہ آہستہ ابھرا ہے۔ امریکہ کی جنگوں تک غیر جانبدار ممالک کے لیئے جائز تھا۔ کہ وہ اپنی فوجیں کرایہ پر دیں۔ گروٹیئس اس رواج کے خلاف تھا۔ لیکن اس کے نظریہ کو عرصہ تک کوئی اہمیت نہیں دی گئی۔ پہلی مرتبہ ۱۷۹۴ء میں امریکن کانگرس نے اعلان کیا۔ کہ امریکہ کے باشندے ایسے محاربین کے خلاف جنگی خدمت انجام نہیں دے سکتے جن سے حکومت امریکہ برسر جنگ نہ ہو۔ اس اصول کو بتدریج ترقی ہوتی گئی۔ اور ۱۸۱۸ء میں امریکہ نے ایک واضح قانون غیر جانبداری مرتب کر لیا۔ برطانیہ نے اس کی تقلید کی۔ اور پھر سارے یورپ نے رفتہ رفتہ ایسے قوانین وضع کر لیے ـــــ لیکن غیر جانبداری کا بین الممالک قانون ۱۹۰۷ء کی ہیگ کانفرنس ہی میں منظور ہوا جس کا لب لباب یہ ہے کہ غیر جانبدار سلطنت کی حدود واجب الاحترام ہیں۔ اور ان پر تجاوز نہیں کرنا چاہیئے۔ ایسی سلطنتوں کی حدود میں کوئی حربی کاروائی نہیں کی جا سکتی۔ نہ ان میں سے فوجیں گزاری جا سکتی ہیں۔ نہ جنگی تیاریوں کے لیئے بطور قاعدہ انہیں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اور نہ ان میں گھس کر دشمن کا تعاقب کیا جا سکتا ہے۔ غیر جانبدار ممالک پر یہ فرض عاید ہوتا ہے۔ کہ وہ محارب فریقین کے ساتھ یکساں سلوک روا رکھیں۔ اور کسی کو اسلحہ یا مالی امداد نہ دیں۔ لیکن پہلی ہی جنگ عظیم میں اس اصول کی خلاف ورزی کی گئی۔ اور دوسری جنگ عظیم میں غیر جانبداری محض ایک حیلہ بن گئی۔ ہر ملک کسی نہ کسی طرح کسی نہ کسی محارب گروہ کے ساتھ ہو گیا۔ اور ایک نئی اصطلاح "محارب غیر جانبداری" ـــ (Belligerent Neutrality) معرض وجود میں آ گئی جس کی رو سے کوئی ملک کسی فریق کی طرف سے

عملاً میدانِ جنگ میں اگرچیکہ نہیں آتا تھا۔ تاہم ہر قسم کی سہولت اسے فراہم کرتا تھا۔

منشورِ اقوامِ متحدہ

دوسری جنگِ عظیم کی ہولناکیاں جاری تھیں۔ قوموں کے حقوق چھینے جا رہے تھے۔ آبادیاں فنا کے گھاٹ اتر رہی تھیں حکومتیں متزلزل ہو رہی تھیں۔ اور سطحِ ارض پر انسانی خون کو پانی سے زیادہ ارزاں کر دیا گیا تھا ——— اس لیے متاثرہ قوموں نے لیگ آف نیشنز کے کھنڈرات پر مجلسِ اقوامِ متحدہ کی تعمیر کا قصد کیا۔ اور اکتوبر ۱۹۴۵ء میں اپنے منشور میں اعلان کیا کہ :-

"ہم باشندگانِ متحدہ اقوام اس عزمِ صمیم کا اظہار کرتے ہیں کہ آنے والی نوعِ انسانی کو جنگ و جدال کی ان تباہ کاریوں اور ہولناکیوں سے مامون و محفوظ کیا جائے جو ہماری اپنی زندگی کے دوران میں دو مرتبہ نسلِ انسانی پر آفت ڈھا چکی ہیں۔ اور ناقابلِ بیان مصائب و آلام نازل کر چکی ہیں

ہم بنیادی حقوقِ انسانی، جسمِ انسانی کی قدر و قیمت، مرد و عورت اور چھوٹی بڑی اقوام کے مساویانہ حقوق پر اپنے ایقان و اذعان کی توثیقِ مزید کرتے ہیں"

اس منشور کے چھٹے باب میں نزاعات کے پُر امن تصفیوں کی صورتیں پیش کی گئی ہیں۔ اور ساتویں باب کی دفعہ ۴۱ میں حکم دیا گیا ہے کہ :-

"سلامتی کونسل طے کرے گی کہ اپنے فیصلوں کو نافذ کرنے کے لیے مسلح افواج کے استعمال کے بغیر اور کیا تدابیر اختیار کرے اور وہ ارکانِ متحدہ اقوام کو ان تدابیر کے اختیار کرنے کا حکم دے گی ان میں معاشی تعلقات، بحری، ہوائی، ڈاک، تار، ریڈیو اور دیگر مواصلاتی اور سیاسی تعلقات کا کلی یا جزوی انقطاع بھی شامل ہے"

اور جارحانہ کارروائی کرنے والے کی گوشمالی کے لیے دفعہ ۴۲ میں بتایا گیا ہے

کہ :-

"اگر سلامتی کونسل کے نزدیک دفعہ ۴۱ کی مندرجات کافی نہ ہوں یا ناکافی ثابت ہوں۔ تو وہ ہوائی، بحری اور بری افواج کے ذریعے بین الاقوامی امن وصیانت کی برقراری و بحالی کے لیئے ضروری کارروائی کرسکتی ہے اس کارروائی میں ارکانِ متحدہ اقوام کی طرف سے مظاہرے، ناکہ بندی اور ہوائی، بحری اور بری افواج کی دیگر کارروائیاں داخل ہیں"

منشورِ اوقیانوس بتاریخ ۱۴ اگست ۱۹۴۱ء سلطنت متحدہ امریکہ کے صدر اور حکومتِ برطانیہ کے وزیرِ اعظم نے ایک مشترکہ اعلان جاری کیا۔ جس کے اہم اقتباسات درج ذیل ہیں :-

۱ : اُن کی حکومتیں علاقہ واری یا دیگر نوع کے استحصال کی جویا نہیں ہیں۔

۲ : ایسی علاقہ واری تبدیلیوں کو بھی وہ نہیں چاہتے۔ جو متعلقہ اقوام کی آزادانہ طور پر ظاہر کی ہوئی خواہشات کے مطابق نہ ہوں۔

۳ : وہ تمام اقوام کے اس حق کا احترام کرتے ہیں۔ کہ وہ کسی قسم کی حکومت کے تحت زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔ اور اُن کی آرزو ہے کہ ان اقوام کو اقتدارِ اعلیٰ اور حکومت خود اختیاری واپس ملے۔ جن سے وہ زبردستی محروم کردی گئی ہیں"

۴ : ان کا عقیدہ ہے کہ حقیقت پسندانہ اور روحانی اسباب کی بنا پر دُنیا کی تمام اقوام کو طاقت کا استعمال ترک کر دینا چاہیئے۔

اعلانِ حقوقِ انسانی منشورِ اقوام متحدہ کی دفعہ ۵۵ ضمن (ج) میں بتایا گیا ہے کہ مجلسِ اقوامِ متحدہ امورِ ذیل کے لیے کوشش کریگی :-

"بلا امتیازِ نسل، نوع، زبان، یا مذہب تمام لوگوں کے لیئے انسانی حقوق اور بنیادی آزادیوں کا عام احترام"۔

اس غرض کے لیئے حقوقِ انسانی کی تدوین کے لیئے ایک کمیشن مقرر کیا گیا جس

نے دیگر امور کے علاوہ قتلِ عام کی ممانعت کی بھی سفارش کی۔ اس کمیشن کی رپورٹ کو دسمبر ۱۹۴۶ء میں جنرل اسمبلی نے منظور کیا۔

دُوسری جنگِ عظیم ۱۹۴۱ء اور ۱۹۴۵ء کے درمیان دنیا میں جو وحشت انگیز واقعات رونما ہوئے وہ ہیوگو گروٹیس کے لیئے بھی حیرت کا باعث ہوں گے جس نے مذہبی جنگوں کی تباہکاری، خونریزی اور بربریت کا مشاہدہ کیا تھا۔ دُوسری جنگِ عظیم میں غیر محاربین اور جنگی قیدیوں کا وسیع پیمانے پر قتل ہُوا۔ ساٹھ لاکھ یورپی یہودی اور لاکھوں سلاؤز کو گولی مار کر ہلاک کیا گیا۔ یا کام کی زیادتی اور زہریلے اثرات کے تحت مار دیا گیا۔ اور اُن کے جسم سے کھاد، غلیا ربڑ اور صابن بنائے گئے۔ ہزاروں طیاروں نے بے شمار شہر تباہ کیئے۔ اور لاکھوں انسان زندہ دفن کر دیئے گئے۔ فوجی اور غیر فوجی آبادیوں میں کوئی امتیاز باقی نہیں رکھا گیا۔ امریکہ کی آبدوز کشتیوں نے انیس سو چوالیس جاپانی تجارتی جہاز غرق کیے محوری ممالک نے امریکہ اور متحدین کے چار ہزار سات سو ستر جہاز ڈبا دیئے جن کا مجموعی وزن ۲۱۱۴۰۰۰ ٹن تھا ——— غیر جانبداری کے حقوق کی ہر طرف مخالفت کی گئی۔ اور پھر ایٹم بم کے ذریعے ہیروشیما اور ناگاساکی کی بربادی ہُوئی۔ اور اعلان کیا گیا۔ کہ یہ طریقے "زندگی اور تہذیب کے تحفظ"، "جنگ کے اختصار" اور "فتح کے حصُول" کے لیئے ضروری ہیں ——— !

دوسری جنگِ عظیم کی تباہ کاریوں سے دُنیا کے ہوش اُڑ گئے۔ اور اُس کے بعد بڑی قوموں نے انسانیت پر ایسے مظالم ڈھائے کہ اعلانِ حقوقِ انسانی، منشورِ اقوامِ متحدہ اور منشورِ اوقیانوس پر دُنیا کا اعتماد باقی نہیں رہا۔ متحدین نے کوریا میں قوانین جنگ کی جو بے حُرمتی کی ہے اُسے آنیوالی نسلیں کبھی مُعاف نہیں کر سکیں گی۔ وہاں غیر فوجی آبادیوں کو بلا امتیاز ہلاک کیا گیا۔ خوفناک بمباری، زہریلی گیس اور ممنوعہ اسلحہ کے بہیمانہ استعمال سے خُدا کی اس زمین پر قیامت بپا کی گئی۔ اور دوسری طرف شمالی افریقہ میں استعماریت کے تحفظ اور چھوٹی چھوٹی قوموں کی

غلامی کی بقاء کے لیے انسان نما درندوں کو حریت پسندوں کی آبادیوں میں اس طرح آزاد چھوڑ دیا گیا۔ کہ ہلاکو اور چنگیز کی روحیں بھی "الامان" اور "الحفیظ" پکار رہی ہونگی

ان حالات میں کوئی شبہ نہیں رہا کہ تیسری جنگِ عظیم میں بڑے بڑے شہر راکھ کے ڈھیر ہو جائیں گے۔ اور کروڑوں مرد، عورتیں اور بچے "معمولاً" ہلاک ہو جائیں گے

آج انسانیت دوست مصلحین تحدیدِ اسلحہ پر زور دے رہے ہیں۔ اور خطرناک ہتھیاروں کے استعمال کو ناجائز قرار دینا چاہتے ہیں۔ لیکن اُن کی اس خواہش کی تکمیل مشکل معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ ہماری دُنیا متعدد مقتدر اعلیٰ مملکتوں پر مشتمل ہے۔ اور ان مملکتوں میں محض معاہدات کے ذریعے امن کا قائم کیا جانا دشوار ہے

بڑی قومیں اپنے مفاد کے لیئے ساری دُنیا کو اپنے اپنے حلقۂ اثر میں لینے کی جدوجہد کر رہی ہیں۔ چھوٹی قومیں باہمی اعتماد سے محروم ہو گئی ہیں۔ اسلحہ سازی کی دوڑ تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی ہے۔ مادہ اندر ہی اندر پکتا جا رہا ہے۔ اور اُس وقت اور اس مقام کا تعین مُشکل معلوم ہوتا ہے جبکہ یہ کوہِ آتش فشاں پھوٹ پڑے گا اور اپنے جلتے ہوئے لاوے کے سیلاب میں ساری متاعِ انسانی کو بہا لے جائیگا

مغربی قوانینِ جنگ کی ناکامی

مغرب کے قوانینِ جنگ کی عمر کم و بیش پچاس سال ہے۔ لیکن ابتداء ہی سے اکثر قوموں نے ان کی خلاف ورزی کی ہے۔ اور وقتاً فوقتاً اپنے اپنے مقاصد کے لیئے ان کی ہیئت کو بدل دیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ یہ قوانینِ انسانیت کے تحفظ میں بڑی حد تک ناکام ہو رہے ہیں۔ اس ناکامی کی حسبِ ذیل وجوہ ہیں:-

۱۔ ان قوانین نے کسی جنگ کے جواز یا عدم جواز پر کوئی توجہ نہیں کی ہے یہ نہیں بتایا گیا ہے کہ کن صورتوں میں جنگ کی اجازت ہے اور کن میں اس کی ممانعت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مغرب میں ہر جنگ جائز ہے۔ خواہ وُہ کسی نیکی کے لیئے ہو، مُلک گیری کے لیئے یا توسیعِ تجارت، لُوٹ اور غارت گری یا استعماریت کے استحکام کی خاطر کی جا رہی ہو۔ اس کے برعکس اسلام نے جنگ کے اغراض و مقاصد

کا تعین کیا ہے۔ اور جدال و قتال کی حدود قائم کر دی ہیں۔ جن کے باہر خونریزی بدترین گناہ اور ایک سنگین جرم ہے۔

۲۔ ان قوانین پر "قانون" کی تعریف صادق ہی نہیں آتی۔ کیونکہ ان میں وہ پائداری نہیں ہے۔ جو کسی قانون کے لیئے ضروری ہوتی ہے۔ ان میں بڑی قومیں ردوبدل کرتی اور انہیں اپنی اغراض کے مطابق ڈھالتی رہتی ہیں۔ بالفاظِ دیگر قوموں کا عمل قانون کے مطابق نہیں ہوتا۔ بلکہ خود قانون ہی اُن کے عمل کے ساتھ ساتھ ترمیم ہوتا چلا جاتا ہے ——— اس کے برعکس اسلامی قانون ایک مضبوط اور مستحکم قانون ہے جسے خدائے ذوالجلال نے مدّون فرمایا ہے۔ اور جس کے اصولوں میں کسی انسان کو سرِ مُو فرق پیدا کرنے کا اختیار حاصل نہیں ہے۔ اس لحاظ سے یہ قانون دنیا کی تمام قوموں کے لیئے یکساں طور پر مفید اور منفعت بخش ثابت ہو سکتا ہے :

۳۔ ان قوانین کا انحصار لڑنے والی قوموں کی باہمی مفاہمت پر ہے۔ جو قومیں آپس میں طے کرتی ہیں۔ کہ جنگ کی صورت میں ان قوانین پر عمل کیا جائے گا صرف وہی ان کی پابند ہوتی ہیں۔ اور وہی ان سے استفادے کا دعویٰ کر سکتی ہیں۔ نیز کوئی فریق ان کی خلاف ورزی کر بیٹھے تو دوسرے فریق کو اس بات کا مکمل اختیار حاصل ہو جاتا ہے۔ کہ وہ اس مفاہمت کو نذرِ آتش کر کے من مانی کارروائیاں شروع کر دے! لیکن اسلامی قانون اخلاقی فرض کے احساس پر قائم ہے جس کی پابندی ہر صورت اور ہر حال میں مسلمانوں پر واجب ہے۔ دشمن کی زیادتی، بہیمیت، وحشت اور بربریت کے باوجود مسلمان ان حدود سے تجاوز نہیں کر سکتے جو کہ اسلام نے اُن کے لیئے مقرر کر دی ہیں۔

یہی وجوہ ہیں جن کی بدولت اسلامی قانونِ جنگ کی برتری ثابت ہو گئی ہے اور جن کے مدِ نظر برنارڈ شا نے ببانگِ دہل کہا ہے کہ آج نوعِ انسانی کو ایک محمدؐ کی سیادت نصیب ہوتی تو خوف و ہراس اور خونریزی و استحصال کا دنیا سے

خاتمہ ہوجاتا۔ اور سارا عالم امن اور چین کی زندگی بسر کرسکتا!

حسبُنا قسماً یارسولَ اللہ!

اغیار کا تعصّب

عام طور پر یورپ اور امریکہ کے باشندے غزواتِ نبوی کو تعصّب کی عینک سے دیکھتے ہیں۔ اور انہیں خوفناک پیرایہ میں بیان کرتے ہیں۔ اُن کے نزدیک یہ جنگیں وحشت و بربریت کا ایک طویل سلسلہ ہیں۔ جہاں انسانی خون کی ارزانی ہے جہاں بے پردہ لونڈیوں کی قطاریں کھڑی ہوجاتی ہیں۔ اور لوٹے ہوئے خزانوں کے ڈھیر لگ جاتے ہیں جن کو مجاہدین اپنے دامن حرص و آز میں سمیٹ لیتے ہیں——! یورپ کی قدیم تاریخ سے اگرچہ ان الزامات کا جواب دیا جاسکتا ہے۔ اور صلیبی جنگوں کی دیوانگی سے ان معترضین کو خاموش کر دیا جاسکتا ہے۔ تاہم عہدِ حاضر میں مغربی تمدن کی خون آشامی کی وجوہ بھی اُن سے پوچھی جاسکتی ہیں۔

قدیم وحشیوں کی طرح تہذیب حاضر کے ان جدید وحشیوں کی قدریں بھی پست ہیں۔ ان کے سامنے بھی کوئی بلند نصب العین نہیں ہے۔ انسانیت کا کوئی قابلِ احترام معیار ان کے پیشِ نظر نہیں ہے۔ وہی دولت کی محبت، اقتدار کی خواہش اور لوٹ اور غارت گری کی لالچ، جو ہزاروں سال پہلے کسی قبیلہ کو جنگ پر اُبھار سکتی تھی۔ آج بھی تہذیب مغربی کے فرزندوں کو شدید خونریزی، زہریلی گیس کی نقصان رسانی، ایٹم بم کی تباہ کاری اور ہائیڈروجن بم کی ہلاکت خیزی پر آمادہ کرتی ہے——! انسانیت کے یہ دعویدار ہیروشیما کی طرف ذرا دیکھیں، منشور اوقیانوس اور اعلانِ حقوقِ انسانی کے علمبردار ناگاساکی کی بربادیوں کی طرف ذرا رُخ کریں، اپنی تہذیب و تمدن کی برکتوں کو مراکش اور کوریا کی آبادیوں میں تلاش کریں۔ جہاں آج بھی انسانی خون کے جمے ہوئے ٹکڑے موجود ہیں۔ اپنی رحمتوں کو ہند چینی اور الجیریا میں دیکھیں جہاں کے دریا آج بھی انسانی خون سے رنگین ہیں۔ آج بھی جلتی ہوئی آبادیوں سے اُٹھتے ہوئے دھوئیں کے بادل آسمانوں پر چھائے ہوئے ہیں یتیموں

کی آہ و بکا سے آج بھی فضائیں معمور ہیں، بیواؤں کی آہیں آج بھی عرشِ اعظم سے ٹکرا رہی ہیں۔ اور ——— اُن نعشوں کا شمار کون کرے جو چپہ چپہ میں بے گور و کفن پڑی ہوئی ہیں۔ عہدِ حاضر میں جبکہ خدا کی اس زمین پر خون کے طوفان اُمڈ رہے ہیں، موت کی آندھیاں چل رہی ہیں، انسانیت خونیں سمندر کی لہروں میں ڈوبتی جارہی ہے، امن و اطمینان کو ایٹمی توپوں کا دہن آ زنگل رہا ہے۔ اور صلح و آشتی کا حسین چہرہ زخموں سے چور چور، ریزہ ریزہ، پاش پاش ہوتا جارہا ہے، عہدِ نبوی کی جنگوں پر ذرا ٹھنڈے دل سے غور کیجئے کہ رسولِ عربی ایک چھوٹی سی شہری مملکت سے اپنی حکومت کا آغاز کرتے ہیں۔ روزانہ دو سو چوہتر مربع میل کے حساب سے یہ مملکت وسعت اختیار کرتی ہے۔ اور دس سال بعد جب آپ کا وصال ہوتا ہے تو دس لاکھ مربع میل سے زاید رقبہ زیرِ اقتدار آچکتا ہے۔ لیکن ایسے وسیع علاقہ کی فتح میں دشمن کے بمشکل ڈیڑھ سو آدمی قتل ہوتے ہیں۔ اور مسلمان فوج کا اس دس سال میں اوسطاً ماہانہ ایک سپاہی شہید ہوتا ہے ———! انسانیت کی یہ عزت تاریخِ تمدن میں اپنا جواب آپ ہے۔ نوعِ انسانی کی یہ حفاظت تاریخِ عالم میں بلاشبہ بے نظیر ہے۔ اور انسانی خون کی یہ حرمت تاریخِ جنگ میں بلاخوفِ تردید بے مثال ہے!

ہر کجا ہنگامۂ عالم بود　　　رحمۃً للعالمینے ہم بود

خلق و تقدیر و ہدایت ابتداست　　　رحمۃً للعالمینے انتہاست

سپہ سالارِ بدر کی تلاش

لیکن آج پھر انسان کی عظمت اور اس کے خون کی حرمت پر حملے ہو رہے ہیں۔ کشمیر کی گردن میں غلامی کا طوق ڈالا جارہا ہے۔ مسلمانوں کو فلسطین سے نکالا جاچکا ہے۔ ہندوستان میں اسپین کی تاریخ دُہرائی جارہی ہے۔ مشرقی پنجاب کی سرزمین خون سے رنگین ہوچکی ہے۔ بہار و بنگال کے چپہ چپہ میں مسلمانوں کی ہڈیاں بکھری ہوئی آج بھی نظر آسکتی ہیں۔ دکن میں زلزلہ آیا ہے اور مراقش کی زمین پھٹ گئی ہے۔ الجیریا کے شہداء کی روحیں فضاؤں میں منڈلا رہی ہیں۔ اور حسرتناک نگاہوں سے آپ

کو دیکھ رہی ہیں ——— آج اولادِ آدم کی رُوحانی اور اخلاقی قدریں مجروح ہو رہی ہیں۔ انسانیت درد و کرب میں مُبتلا ہے۔ قوموں کی جوعِ ارضی سے نسلِ انسانی لرزہ براندام ہے۔ اِدھر ہائیڈروجن بم اُس میں احساسِ پستی پیدا کر رہا ہے۔ اُدھر کوبالٹ بم اُسے جبیں سائی پر مجبور کر رہا ہے۔ کہیں کمیونزم الٰہیت کی بنیادوں کو ہلا رہا ہے۔ اور کہیں ڈالر قاضی الحاجات کا رُوپ دھار رہا ہے ——— ! زمانہ کی رفتار طاغوتی قوتوں کی مقاومت کی طالب ہے۔ وقت کی آواز جہاد کے جواز کا اعلان کر رہی ہے قدرت پرستارانِ حق کی طرف بےچینی سے دیکھ رہی ہے۔ کیونکہ دُنیا کُفر و باطل کی آگ میں جل رہی ہے۔ اور مجبور و مظلوم انسانیت سپہ سالارِ مدینہ کو تلاش کر رہی ہے ——— !

۱۱ رجون ۱۹۵۶ء
۱۸۶۶۔ کریم پورہ
ایبٹ آباد۔

چوہدری افتخار علی پبلشر نے حمایت اسلام پریس لاہور میں باہتمام شیخ حسن الدین منیجر چھپوا کر پنجاب بک ڈپو لاہور سے شائع کیا

ڈرامہ۔ خوبصورت بلا۔

آغا حشر کاشمیری